وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ وفاق المدارس ملتان

جلد نمبر ۲۴ شمارہ ۱۲ ذوالحجہ ۱۴۴۷ھ جون ۲۰۲۶ء

بیاد

شمس العلماء
حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ العلماء
حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ

محدث العصر
حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

مفکر اسلام
حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ

جامع المعقول والمنقول
حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

رئیس المحدثین
حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

استاذ المحدثین
حضرت مولانا عبد الرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ

سرپرست

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

شیخ الحدیث حضرت مولانا انوار الحق حقانی مدظلہم
سینئر نائب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر اعلیٰ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم
ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر

مولانا محمد احمد حافظ

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

وفاق المدارس العربیہ پاکستان گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

فون نمبر 061-6514525-6514526-27 فیکس نمبر 061-6539485
Email:wifaqulmadaris@gmisl.com web:www.wifaqulmadaris.org

ناشر: حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری ◉ مطبع: اقرا اختر پرنٹنگ پریس پرانی غلہ منڈی بوہڑ گیٹ ملتان
شائع کردہ مرکزی دفتر وفاق المدارس العربیہ گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

آسمانِ علم پہ تاریکی چھارہی ہے	کلمۃ المدیر	۳
احسان اور تصوف	حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ	۶
تحریک تجدّد کا پس منظر اور اس کی فکری بنیادیں	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم	۱۵
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا؟!	مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی	۲۷
آیئے! متون احادیث کی کتب کا مطالعہ کریں	مولانا محمد طارق تونسوی	۳۱
ایمان پر استقامت، وقت کا ایک اہم تقاضا	مولانا مرشد قاسمی	۳۶
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس شہید رحمہ اللہ	مولانا مفتی سراج الحسن	۴۰
اکابر کے منظورِ نظر، سیّد سلمان گیلانیؒ	مولانا حنیف خالد	۴۳
سافٹ ویئر کی ماہیت وحقیقت	ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی	۵۳
اُردو املا اور ہم	ابو عالیہ ناز قاسمی	۶۱

﴿مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں﴾

سالانہ بدل اشتراک

بیرون ملک امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک ۳۰ ڈالر- سعودی عرب، انڈیا اور متحدہ امارات وغیرہ ۲۳ ڈالر- ایران، بنگلہ دیش ۲۰ ڈالر-

اندرون ملک قیمت: فی شمارہ: 40 روپے، زرسالانہ مع ڈاک خرچ: 540 روپے

آسمانِ علم پہ تاریکی چھا رہی ہے

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

گزشتہ ماہ دو اہم علمی و دینی شخصیات اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی کے مہتمم اور ممتاز عالم دین مولانا اشرف علی اپریل ۲۰۲۶ء کے آخری ہفتے میں وفات پا گئے۔ وہ شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین تھے۔ آپ کچھ عرصہ سے علیل تھے، اسپتال داخل رہے، صحت یاب نہ ہو سکے اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

آپ کی رحلت پر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے قائدین شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی (صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان)، شیخ الحدیث حضرت مولانا انوار الحق، شیخ الحدیث مولانا محمد حنیف جالندھری نے جانشین شیخ القرآن مولانا اشرف علی کی رحلت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی رحلت کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا، انھوں نے کہا کہ مولانا اشرف علیؒ کی شخصیت میں جو رکھ رکھاؤ اور اجتماعیت سے وابستگی تھی وہ قابل تحسین ہے، مولانا اشرف علی مرحوم نے شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان رحمہ اللہ کی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی زندگی مختلف دینی اور اصلاحی تحریکوں کے لیے وقف کیے رکھی، وہ خیر کے ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے۔

دوسری شخصیت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس ترنگزئی شہید رحمہ اللہ کی ہے، جنہیں ۵ رمئی ۲۰۲۶ء کو اُتمان زئی چارسدہ میں دہشت گردوں نے نہایت بے دردی کے ساتھ گولیوں کے فائر کر کے شہید کر دیا۔

حضرت مولانا محمد ادریس رحمہ اللہ دو بڑے دینی مدارس میں استاذ الحدیث تھے۔ آپ ہزاروں علماء کے استاذ تھے۔ اپنی تمام زندگی قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں میں گزاری۔ آپ کوکے پی کے میں بزرگ عالمِ دین اور روحانی شخصیت کے طور پر جانا جاتا تھا۔ آپ با اخلاق، متواضع اور سنجیدہ مزاج شخصیت کے طور پر مشہور تھے۔ ان کے خطبات اور دروس کو بڑی تعداد میں لوگ سنتے تھے، علماء اور عامۃ الناس کے مرجع تھے۔ آپ کے اندوہناک قتل نے علمی و دینی حلقوں کو گہرے غم و غصے میں مبتلا کیا ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس صاحب کی شہادت نے ایک بار پھر یہ سوال شدت سے کھڑا کر دیا ہے کہ آخر ملک میں علماء، خطباء اور دینی شخصیات کب تک عدمِ تحفظ کا شکار رہیں گی؟ ایک ایسے عالمِ دین کو نشانہ بنایا جانا جس کی پوری زندگی درسِ حدیث، تعلیم و تربیت اور علمی خدمت میں گزری ہو؛ نہ صرف افسوس ناک بلکہ پورے معاشرے

کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

ایک طویل فہرست ہے ایسے علماء کی جنہیں ٹارگٹ کیا گیا۔ان کے قاتل ہمیشہ نامعلوم ہی رہے۔یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ جب تک ماضی کے سانحات کے مجرموں کو قانون کے کٹہرے میں لاکر قرار واقعی سزا نہیں دی جائے گی، ایسے اندوہناک واقعات کا سلسلہ رکنا مشکل ہوگا۔ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ علماء سمیت تمام شہریوں کے جان ومال کے تحفظ کو یقینی بنائے اور دینی طبقات میں پائی جانے والی بے چینی کا فوری تدارک کرے۔

دونوں شخصیات کی رحلت پر وفاق المدارس کے قائدین نے جس انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا، وہ اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ ہمارے دینی ادارے صرف درسگاہیں نہیں بلکہ اخلاق، اعتدال، اجتماعیت اور اصلاحِ معاشرہ کی زندہ روایتیں ہیں۔ایسے علماء اپنی پوری زندگی خاموش خدمت، دینی استقامت اور فکری تربیت میں صرف کردیتے ہیں۔علماء کی رحلت محض ایک فرد کا انتقال نہیں بلکہ ایک عہد، ایک اسلوب اور ایک علمی روایت کا دھیرے دھیرے کمزور پڑ جانا ہوتا ہے۔آج جبکہ معاشرہ فکری انتشار، اخلاقی بحران اور سماجی بے سمتی کا شکار ہے، ایسے باوقار اور متوازن مزاج رکھنے والے علماء کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کی جارہی ہے۔

مدارس کے متعلق حکومت کی ناروا پالیسیاں

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے مرکزی قائدین نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ:

'' وہ مدارس کے ساتھ طے شدہ معاہدوں کی پاسداری کرے اور کسی بھی قسم کی خلاف ورزی سے باز رہے۔انہوں نے کہا کہ چاروں صوبوں میں وفاق کی ترتیب کے مطابق فی الفور قانون سازی کی جائے تاکہ مدارس کے معاملات میں یکسانیت پیدا ہو اور رجسٹریشن کا عمل آگے بڑھایا جاسکے۔قائدین وفاق نے بلوچستان میں بعض مدارس کو ہراساں کرنے اور انہیں سیل کرنے کی کوششوں پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اسے افسوسناک اور ناقابلِ قبول قرار دیا۔انہوں نے کہا کہ دینی مدارس ملک میں دینی وتعلیمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، انہیں بلا جواز پریشان کرنا مناسب نہیں۔بیان میں پنجاب حکومت کی جانب سے قربانی کی کھالوں، زکوٰۃ وعشر جمع کرنے کے حوالے سے طے شدہ معاہدوں کے برعکس مدارس کو رجسٹریشن پر مجبور کرنے کے اقدام کو بھی سختی سے مسترد کیا گیا۔قائدین نے واضح کیا کہ اس قسم کے اقدامات نہ صرف معاہدوں کی خلاف ورزی ہیں بلکہ مدارس کی حریت اور آزادی وخودمختاری کے بھی منافی ہے جو کسی صورت قابل قبول نہیں۔وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے قائدین نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ فوری طور پر ان معاملات کا نوٹس لے، معاہدوں پر عملدرآمد یقینی بنائے اور مدارس

کے ساتھ تعاون اور اعتماد کی فضا کو برقرار رکھے۔''

وفاق المدارس العربیہ کی جانب سے مدارس کے حوالے سے حکومتی پالیسیوں پر اظہارِ تشویش بھی غیر اہم نہیں۔

دینی مدارس پاکستان کے تعلیمی نظام کا ایک تاریخی اور مؤثر حصہ ہیں، جہاں لاکھوں طلبہ دینی تعلیم مفت حاصل کر رہے ہیں۔ان اداروں کے ساتھ معاملات ہمیشہ افہام وتفہیم، اعتماد اور باہمی احترام کی بنیاد پر طے ہونے چاہییں۔ بدقسمتی سے بسا اوقات معاملات کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے جیسے خدانخواستہ دینی مدارس ملک دشمنی کے اڈے ہوں۔نہایت سادہ معاملات کو بھی الجھایا اور پیچیدہ بنایا جاتا ہے۔

دوسری طرف آپ عصری تعلیمی اداروں کو دیکھیے کہ ملک کی بڑی یونیورسٹیوں میں ہولی اور دیوالی کے تہوار باقاعدگی سے منائے جانے لگے ہیں۔اس موقع پر ہلڑ بازی، فحاشی، عریانی، اور منشیات کے استعمال کے جو مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں وہ شرفا کے سر شرم سے جھکانے کے لیے کافی ہیں۔اب تو کالج یونیورسٹیز کے اساتذہ کی جانب سے طالبات کو جنسی ہراسانی کی شکایات ایک تسلسل سے ذرائع ابلاغ پر آنے لگی ہیں۔سرکار والا تبار کو کبھی ان عصری تعلیمی اداروں کی تطہیر کا خیال نہیں آتا۔ان اداروں میں کرپشن کا بازار گرم رہتا ہے لیکن ان کے اکاؤنٹس کی چھان بین کا ادنیٰ تصور بھی نہیں آتا۔نجی تعلیمی ادارے تعلیم کے نام پر کیا کچھ پڑھا رہے ہیں؟ اس پر کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں۔۔۔۔برق گرتی ہے تو بے چارے دینی تعلیمی اداروں پر۔آئے روز سیکورٹی ایجنسیز کے افراد مخصوص فارم لے کر چھان بین کے لیے دینی اداروں میں پہنچے ہوتے ہیں۔مختلف حیلے بہانوں انہیں تنگ کیا جاتا ہے۔آخر مدارس کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں ہوتا ہے؟؟۔

ہمارے خیال میں حکومت اور دینی قیادت کے درمیان جو معاہدات ہیں ان کی پاسداری ریاستی سنجیدگی اور سیاسی دیانت کا تقاضا ہے۔ایسے اقدامات جن سے مدارس خود کو دباؤ، نگرانی یا امتیازی سلوک کا شکار محسوس کریں، وہ نہ صرف بداعتمادی کو جنم دیتے ہیں بلکہ قومی وحدت کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

خصوصاً بلوچستان میں مدارس کو ہراساں کرنے یا سیل کرنے کی اطلاعات اور پنجاب میں قربانی کی کھالوں، زکوٰۃ وعشر کے معاملات کو رجسٹریشن سے مشروط کرنے جیسے اقدامات نے دینی حلقوں میں اضطراب پیدا کیا ہے۔آج ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت، دینی قیادت اور ریاستی ادارے محاذ آرائی کی بجائے سنجیدہ مکالمے کا راستہ اختیار کریں۔علماء کے تحفظ، مدارس کے وقار، قانونی شفافیت اور قومی مفاد ان سب کو ساتھ لے کر چلنا ہی دانشمندی ہے۔ایسے نازک وقت میں تحمل، تدبر اور باہمی اعتماد ہی وہ راستہ ہے جو ملک کو مزید تقسیم اور اضطراب سے بچا سکتا ہے۔

احسان اور تصوف

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

(دوسرا و آخری حصہ)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ ملت اسلامیہ کے زعیم وقائد، علم وفضل میں یکتا، مرشد کامل، شیخ طریقت اور اسلاف کی روایات کے بہت بڑے محافظ تھے۔ ذیل میں آپ کی ایک نایاب تقریر پیش کی جارہی ہے، اس میں آپ نے احسان وتصوف،، بیعت، مشاغل طریقت کے متعلق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں سبق آموز بحث فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے کہ ہم بھی اس سے سبق حاصل کر کے حیٰوۃ طیبہ اور اطمینان قلب کی دولت لازوال سے ہمکنار ہوں۔

احسان، صفائی قلب اور تصوف:

(گزشتہ سے پیوستہ) احسان کوئی چیز نہیں، دل کی ہی صفائی حاصل کرنے کا نام احسان ہے اور یہی تصوف کا مقصد ہے۔ تصوف کا مقصد کوئی نئی چیز نہیں ہے حدیث جبرئیل میں جو چیز مذکور ہے وہی سچ ہے۔ مگر زمانہ کے بُعد کی وجہ سے طبیعتوں میں میل زیادہ ہوگیا جس کی وجہ سے مانجنے کی ضرورت زیادہ ہوگئی۔

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جو اُصول تصوف میں ذکر کئے گئے ہیں یعنی بارہ تسبیحیں، ذکر جہری، پاس انفاس، مراقبہ وغیرہ اس کا بھی کسی حدیث میں ذکر نہیں ہے، اُن کا یہ اعتراض غلط ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جہاد کے لئے تلوار، تیر وکمان نیزہ وغیرہ کا تذکرہ آتا ہے اور بندوق مشین گن، گولہ بارود اور ہوائی جہاز کا کوئی تذکرہ نہیں آتا ہے۔ آج اگر مسلمانوں کو شرعی جہاد کی ضرورت پڑے تو آپ یہ کہیں گے کہ جنگ تلوار سے کرنی چاہیے کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جنگ فقط تلوار، نیزہ، تیر وکمان سے کرتے تھے، ہرگز آپ ایسا نہیں کر سکتے اور اگر آج ایسا کریں گے تو دشمن آپ کو دور ہی سے فنا کر دیں گے مشین گن اور توپوں وغیرہ سے، اگر دشمن حملہ کرے تو ہم کو بھی وہی چیز اختیار کرنی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکم فرمایا ہے:

"وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" الخ

''جو تم سے قوت ہو سکے دشمنوں کے مقابلہ کے واسطے تیار کرو۔''

مقصود جہاد سے اعلاء کلمۃ اللہ ہے جس چیز سے بھی ہو اور جس چیز کی ضرورت پڑے اس کو استعمال کرو، جس سے

دشمن کو شکست دے سکو اس کو مہیا کرو اور مقابلہ کرو، اسی طرح جس زمانہ میں آقائے نامدار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے تو اُس زمانہ میں تھوڑی ریاضت کی ضرورت پڑتی تھی اور اسی سے کام ہو جاتا تھا اور جتنے دن زیادہ گزرتے گئے ریاضتوں کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی اسی وجہ سے چلہ۔ بارہ تسبیح - ذکر جہری اور پاس انفاس وغیرہ قلب کی صفائی کے لئے متعین کئے گئے۔

آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن شریف میں زیر وزبر نہیں تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں کتابی شکل میں جمع کرایا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ترتیب دیا۔ مگر زیر وزبر تب بھی نہیں لگائے گئے۔ صحابہ کرام کی زبان عربی تھی وہ بغیر زیر وزبر کے پڑھتے تھے جیسے کہ ہم اردو زبان والے اُردو کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ آج کوئی بنگالی، برمی یا انڈونیشیا والے سے کہا جائے کہ اُردو کی صحیح عبارت پڑھو تو وہ نہیں پڑھ سکتا ہے۔ جس طرح ہم زیر وزبر کے نہ ہوتے ہوئے صحیح پڑھتے ہیں اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قرآن جس میں نہ زیر نہ زبر نہ نقطہ کچھ بھی نہیں تھا صحابہ کرام صحیح پڑھتے تھے مگر تھوڑے ہی زمانہ بعد اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عجمیوں کے خلط ملط کی وجہ سے لوگ زیر وزبر کے محتاج ہو گئے۔ پس یہ اعتراض کہ قرآن میں زیر زبر نہیں لگانا چاہیے کیونکہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں پائے گئے تو کیا یہ اعتراض کوئی وزن رکھتا ہے؟۔ بے شک اس زمانہ میں لوگ بغیر زیر وزبر کے تلاوت کر لیتے تھے مگر آج مکہ اور مدینہ والے جن کی زبان عربی ہے وہ بھی بغیر زیر وزبر و نقطہ کے نہیں پڑھ سکتے۔ جس طرح ہم محتاج ہیں صرف ونحو کے اسی طرح عرب والے بھی محتاج ہیں اور وہ بھی بغیر زیر وزبر اور نقطہ کے نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ تو زمانہ کے بدلنے کی وجہ سے احوال بدلتے رہتے ہیں لیکن وہ احوال جو مقصود کو بدلنے والے نہ ہوں اُن کو سنت ہی کہا جائے گا۔ مثلاً کسی شخص نے روٹی پکانے والے کو متعین کیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ لکڑی، چولہا، تو سب چیزیں مہیا کریں۔ لکڑی نہ ملے کوئلہ نہ ملے تو اوپلہ کو بھی استعمال کیا جائے گا غرض جس چیز پر روٹی پکانا موقوف ہو اسی کو طلب کیا جائے گا۔

مختصر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں احسان حاصل کرنے کے لئے ریاضت کی ضرورت نہیں تھی مگر آج ہمارے مرشدوں نے بتلایا کہ اس طرح سے ذکر کرو اگر کوئی کہے کہ یہ بدعت ہے تو سراسر غلطی ہے۔

ذکر کی تاکید:

خدا نے کئی جگہ ذکر کی تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

"وَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا" الخ

کھڑے اور بیٹھے کی کوئی قید نہیں ہے۔ اسی طرح لفظ اللہ، سبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ ضرب کے ساتھ ہو یا بلا ضرب-

ارشادِ خداوندی کے تحت میں سب داخل ہے۔ دوسرے موقع پر قرآن شریف میں ہے۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا" الخ

تیسرا ارشاد ہے:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ

اگر تم مجھ کو یاد کرو گے میں تم کو یاد کروں گا۔ کوئی قید نہیں کہ کس طرح سے ذکر کیا جائے۔ مطلقاً ذکر کا حکم ہے۔ ہمارے بڑے تجربہ کار لوگوں نے کہا ہے کہ ذکر سری سانس کے ساتھ اور ذکر خفی روح کے ساتھ کرو۔

بہرحال ذکر کوئی بدعت نہیں ہے جیسے حکم دیا تھا جہاد کرنے کا کہ دشمن کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے جہاد کرو چاہے تیر سے چاہے تلوار سے، چاہے توپ یا مشین گنوں سے جس طرح تم انجام دے سکو اور دشمن کو شکست دے سکو، جیسے قرآن کریم کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے تو زیر وزبر لگانا اور عکسی قرآن چھاپنا سب اسی کے حکم میں ہے۔ تم کو حج کا حکم دیا گیا ہے تو پہلے اونٹوں سے سفر کرتے تھے تو اس کی ضرورت ہوتی تھی اور آج جہازوں اور لاریوں پر سفر کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی بیوقوف کہے کہ یہ بدعت ہے میں تو ہندوستان سے اونٹ پر سفر کروں گا تو کیا آپ کر سکتے ہیں؟۔ اسی طرح سے جدہ پہنچنے کے بعد لاریوں سے سفر ہوتا ہے تو مقصود بیت اللہ کی حاضری ہے جس طرح سے ہو اس کو انجام دیا جائے، مقصد میں کوئی فرق نہیں آیا زمانہ کی ضرورت کی حیثیت سے فرق پڑ گیا ہے۔

تو میرے بزرگو! آج یہ کہنا کہ تصوف اور سلوک میں جو باتیں ہیں بدعت ہیں یہ غلط ہے، وہ مامور بہ ہیں اُن پر عمل کرنا ہوگا کیونکہ اصل مقصد تصوف میں احسان ہے اُس کے حاصل کرنے کے جو طریقے خلاف شریعت نہیں ہیں وہ سب ضروری ہیں البتہ اگر کوئی شخص کہے کہ مجھ کو خدا تک پہنچنے کے لئے قوال ڈھول اور گانے والے کی ضرورت ہے تو یہ خلاف شریعت ہے۔ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ان چیزوں کی ممانعت کی ہے تو جن چیزوں سے ممانعت کی گئی وہ سنت میں داخل نہیں ہیں۔

بیعت کے فوائد:

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ بیعت کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے یہ شبہ غلط ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی اور قرآن وحدیث میں اُس کا ذکر موجود ہے۔

حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا وہ اپنی کتاب ''صراط مستقیم'' میں بیعت کے فائدے بتلاتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی برگزیدہ بندے کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے تو اس کی قبولیت کی وجہ سے خدا کی رحمت اس کی کفالت کرتی ہے، اور اس کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک طریقہ سے اُس کی عصمت کی

حفاظت کی جاتی ہے۔ اگر اُس کا مرشد بڑی عزت والا ہے تو اس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ تیرا فلاں مرید فلاں خرابی میں مبتلا ہو رہا ہے اس کو نکالا جائے تو مرشد اس کو مناسب تدبیر سے اس خرابی سے نکالتا ہے، کبھی خود خداوند کریم ہی اس مرید کو خرابی سے بچاتا ہے کبھی فرشتہ کو حکم دیا جاتا ہے یا اور کسی ذریعہ سے اُس کی حفاظت کی جاتی ہے مثلاً مرشد کی صورت میں آ کر فرشتہ اُسے بچاتا ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ زلیخا کے ساتھ مشہور ہے کہ اُس نے سات کوٹھریوں میں بند کر کے وصال چاہا اور اُن پر جبر کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا معاذ اللہ میں اپنے مالک کی نافرمانی کروں؟ اُس کی بیوی پر ہاتھ ڈالوں اُس نے مجھ پر بڑے بڑے احسان کئے ہیں، میں ظالم نہیں ہوسکتا ہوں، اُس نے بہت مجبور کیا، پُھسلا یا اور پیچھا کیا اور قریب تھا کہ برائی میں مبتلا ہو جائیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۔۔ الخ۔

تو اللہ تعالیٰ نے حفاظت کے واسطے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو مقرر کیا۔ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت میں آئے وہ سامنے کھڑے ہو کر انگلی منہ میں دبائے ہوئے تھے اور اشارے سے کہہ رہے تھے کہ خبردار اس میں مبتلا نہ ہونا حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی اور اللہ نے ان کو بچا لیا۔

حضرت سید شہید رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کامل کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا کسی گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ کی طرف سے کسی روحانی ذریعہ سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ بیعت کے بہت زیادہ فوائد ہیں۔ قرآن شریف میں ہے ''کونوا مع الصادقین'' آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی کسی پارٹی میں داخل ہوتا ہے تو اُس پارٹی کے تمام بڑوں سے اُس کے تعلقات ہو جاتے ہیں اور وہ بڑے لوگ اس کا خیال رکھتے ہیں۔

تو آخرت والے جو خدا کے سچے بندے ہیں تو اُن میں یہ بات کیونکر نہ ہوگی؟!۔ اُن میں تعلقات کی بات بہت اونچی ہوتی ہے۔ اگر تم اللہ کے کسی مقبول بندے کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تو جماعت کے تمام بڑوں سے خواہ دنیا میں ہوں یا آخرت میں سب سے تعلق ہو جاتا ہے اور وہ لوگ دعا کرتے ہیں، اپنی ہمت سے خبر گیری کرتے ہیں۔

شریعت وطریقت:

میرے بھائیوں! نہ بیعت بدعت ہے نہ طریقت بدعت ہے اور نہ طریقت شریعت سے جدا ہے۔ طریقت شریعت کی خادم اور اس کی تکمیل کرنے والی ہے۔ بڑے بڑے لوگ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ بہاء الدین رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ شہاب الدین

سہروردی رحمۃ اللہ علیہ ان بزرگوں نے وہ طریقے جاری کئے جن سے اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل ہو۔ ان طریقوں میں کوئی ذرہ برابر شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ ان طریقوں سے مقصود قربت اور آخرت کا حاصل کرنا تھا۔

نام کے پیر:

مگر جیسے ہر جماعت میں کھرے کھوٹے ہوتے ہیں اس طرح سے اس جماعت میں بھی کچھ ایسے لوگ داخل ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے خرابی پیدا ہو رہی ہے، دین کو جال بنا کر دنیا حاصل کرنے والے ہر جماعت میں ہر زمانے میں ہوتے آئے ہیں۔ ایک دو کی برائی کی وجہ سے پورے دین میں برائی نہیں ہوتی ہے۔ ہاں بیعت ہونے کے وقت مرشد کا انتخاب سوچ سمجھ کر کھرا کھوٹا دیکھ کر کرنا چاہیے۔ حضرت مولانا روم نے فرمایا ہے:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نہ باید داد دست

بسا اوقات شیطان آدم کے بھیس میں آئے گا۔

تم کو سوچنا چاہئے سمجھنا چاہیے کہ جب تمہارا کچہری میں مقدمہ ہوتا ہے تو ہر وکیل کو وکیل نہیں بناتے اور جب کبھی تم بیمار ہوتے ہو تو ہر ڈاکٹر کو معالج نہیں بناتے اور نہ ہر حکیم کے پاس جاتے ہو، بلکہ سوچتے ہو کہ اچھے سے اچھا وکیل اور اچھے سے اچھا ڈاکٹر حاصل کریں۔ جب دنیا میں یہ معاملہ ہوتا ہے تو اللہ کی رضا اور آخرت کے واسطے جو ملا اس کے ہاتھ پر کیسے بیعت کرنا چاہیے اچھا ہو یا برا نمازی ہو یا نہ ہو، عورتوں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ملا کر بے پردگی کے ساتھ بیعت کرتا ہو، ہر ایک بیعت کے لئے کیسے ہو سکتا ہے؟

عورتوں سے بیعت لینے کی صورت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کی بیعت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کرتے تھے اور اگر مجمع بڑا ہوتا تو کپڑا پکڑا کر بیعت لیتے تھے مگر عورتوں کی بیعت کبھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں لی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ بخاری میں یہ روایت کئی جگہ ہے کہ

وَاللّٰہِ مَا مَسَّتْ یَدُ رَسُولِ اللّٰہِ یَدِ النِّسَاءِ اِذَا بَایَعَھُنَّ،

خدا کی قسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوا۔ بیعت کے وقت پردہ کر کے باہر سے بیعت کرتے تھے، زبان سے یا کپڑے سے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر متقی پرہیزگار کوئی اور نہیں ہو سکتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو کسی اجنبی عورت

کو سامنے نہ کرتے تھے اور نہ ہاتھ سے ہاتھ ملا کر بیعت کرتے تھے مگر آج یہ گمراہ اور شیطان کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے آؤ، تم پردہ اُٹھاؤ ہم تم کو محشر میں کیسے پہچانیں گے جب تک تمہارا چہرہ نہ دیکھیں گے، تم تو ہماری بیٹیاں ہو تم تو پوتیاں، نواسیاں ہو، یہ تمام شیطانی کاروائیاں ہیں۔

جناب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کے آقا تھے، سب عورتیں آپ کی بیٹیاں تھیں اور آپ کے ازواج مطہرات کے بارے میں فرمایا گیا ہے ازواجہا امھاتھم جس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویاں کل مومنین کی مائیں تھیں تو ہم آپ کی اولاد کے درجے میں ہوئے مگر اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بے پردہ سامنے نہیں آتے ہاتھ سے ہاتھ نہیں ملاتے لیکن آج ایسے غلط کار لوگ (پیدا ہو گئے) ہیں جو پردہ مٹواتے ہیں بدن دبواتے ہیں اور تنہائی میں جمع ہوتے ہیں، یہ سب غلط ناجائز اور حرام ہے، جو یہ کرتا ہے وہ بزرگ نہیں ہے، پیر نہیں ہے، بلکہ گمراہ شیطان ہے، اس سے بچنا چاہیے، ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیے۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا طاعة للمخلوق في معصية الخالق او كما قال - اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کسی مخلوق کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ایک سریہ کا سردار بنایا اور حکم دیا کہ اس کی تابعداری کرو۔ سب راستے میں جا رہے تھے کہ ایک جگہ پہنچ کر ایک شخص نے سردار سے کچھ مذاق کیا۔ اس پر ان کو غصہ آ گیا، انہوں نے حکم دیا کہ لکڑیاں جمع کرو، پھر حکم دیا کہ ان میں آگ لگاؤ۔ پھر کہا اس میں کود و کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ تم میری تابعداری کرنا۔ بعض لوگوں نے کہا ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے اور انہوں نے کودنے کا ارادہ کیا اور بعض لوگوں نے کہا ہم نے آگ ہی سے بچنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کی ہے ہم اپنے آپ کو آگ کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں؟ چنانچہ یہ لوگ کودنے سے جھجکے اور دوسروں کو بھی منع کیا۔ اس سلسلہ میں اختلاف ہوتا رہا تا آنکہ آگ بجھ گئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اور سردار کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ جب واپس ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس معاملہ کا ذکر کیا تو آپ بہت خفا ہوئے۔ آپ نے دونوں کو ڈانٹا، سردار کو بھی اور ان لوگوں کو بھی جنہوں نے کودنے کا ارادہ کیا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ خلاف شریعت کسی کی تابعداری جائز نہیں۔ اگر کوئی مرشد کہے بُت کو سجدہ کرو تو ہرگز اس کی تابعداری نہیں کرنی چاہیے مرشد کو ایسی بات نہیں کرنی چاہئے اگر وہ کرتا ہے تو پیر نہیں شیطان ہے۔ بعض بیوقوف کہتے ہیں:

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منز لہا

اور اس کے غلط معنے بیان کرتے ہیں اگر مرشد شریعت کے خلاف کرتا ہے تو اس کی تابعداری ہرگز نہیں کرنی

چاہیے۔ بہر حال بیعت کرنا امر شرعی ہے اور سلوک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری اور خدا کی خوشنودی ہی کا نام ہے جو کچھ کمال ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری میں ہے آپ سے محبت کرنا آپ کی حکم کی ہوئی باتوں پر چلنا اسی میں نجات ہے اسی میں کمال اطاعت ہے۔

عشق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معنیٰ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یو من احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ و الناس اجمعین او کما قال۔

تم میں سے کوئی کامل ایمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے باپ اولاد اور تمام لوگوں سے اس کے نزدیک زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت زیادہ سے زیادہ ہونی چاہیے۔ تمام خاندان تمام دنیا سے بڑھی ہوئی ہونی ضروری ہے۔ آج ہم اپنی بے وقوفیوں کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر آپ کے طریقے کو چھوڑتے ہیں، آپ کی صورت سے نفرت کرتے ہیں، آپ کے دشمن کی صورت بناتے ہیں، اور ان کے فیشن کو اپنا فیشن سمجھتے ہیں، داڑھیاں کتر واتے، انگریزی بال رکھتے ہیں اور اس جیسے کام کرتے ہیں، یہ انتہائی غلطی ہے اور اس کی وجہ سے خدا کا غضب ہوتا ہے اور خدا کی رحمت دُور ہوتی ہے۔

اے میرے بھائیو! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ-

کہہ دو کہ اگر خدا کی خوشنودی اور رضا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو ان سے محبت رکھو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے:

قصوا الشوارب واعفوا اللحیٰ و خالفوا الیہود-

مشرکین کی صورت و سیرت کے خلاف داڑھیاں بڑھاؤ۔ مونچھیں کتر واؤ۔

آج ہماری یہ حالت ہوگئی ہے کہ خدا کے دشمنوں کی صورتیں اختیار کئے ہوئے ہیں، اس سے بچنا چاہیے کہ کہیں خدا کا غضب نازل نہ ہو جائے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت و سیرت اختیار کرنا چاہیے اور ہمیشہ خدا کا ذکر کرنا چاہیے۔ اس کے ذکر سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیے۔

عمر عزیز کی قدر و قیمت اور بہترین مشغلہ:

میرے بھائیو!!! اس عزیز عمر کو جو ملی ہوئی ہے، غنیمت سمجھیے اور ہر وقت خدا کا ذکر کرتے رہیے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے غافل نہ ہونا چاہیے، یہ وقت بڑی نعمت ہے، اور قلب کی صفائی کرنی چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: **لکل شی صقالة و صقالة القلب ذکر الله!**۔

ہر چیز کے مانجنے اور چمکانے کی چیزیں ہوتی ہیں جن سے ان کو مانجا جاتا ہے اور صاف کیا جاتا ہے۔ قلب کی صفائی اور اس کو مانجنے کے لئے اللہ کا ذکر ہے: پھر فرمایا: **مامن عمل انجیٰ من ذکر الله**

کوئی چیز خدا کے عذاب سے اس قدر بچانے والی نہیں ہے جس قدر خدا کا ذکر بچاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے غصہ اور اس کے عذاب سے بچنے کی بہترین صورت اللہ کا ذکر ہے۔ ایک روز جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی مجلس میں ذکر اللہ کی فضیلت بیان فرمار ہے تھے کہ قلوب کی اصلاح کرنا چاہیے اور یہ کہ یہ ذکر اللہ ہی سے ہو سکتی ہے۔ ایک صاحب نے اس مجلس میں دریافت کیا یا رسول اللہ! اللہ کا ذکر جہاد فی سبیل اللہ سے بھی زیادہ افضل ہے ایک شخص اللہ کی راہ میں سر کٹواتا ہے وہ افضل ہے یا خدا کا ذکر کرنے والا؟ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ کی راہ میں نکلا اور سر سے پیر تک لہولہان اور قتل ہو گیا وہ شخص بھی اس قدر خدا کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے والا نہیں جس قدر خدا کا ذکر کرنے والا کیونکہ اگر جہاد کرنے والا ذکر اللہ نہیں کرتا تو وہ مقبول نہیں، جہاد میں بھی خدا کا حکم ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْن

جب تمہاری مڈبھیڑ دشمن سے ہو تو جم جاؤ اور خدا کا ذکر کرو۔

پس خدا کی یاد جہاد کی جڑ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم کیا گیا تھا أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ نماز کو میری یاد کے لئے قائم کرو۔ بڑا مقصود اللہ کا ذکر ہے اس کی بڑی وقعت و فضیلت ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

مثل الذين يذكرون الله و الذي لا يذكر كمثل الحي و الميت.

ذکر کرنیوالوں اور نہ کرنیوالوں کی مثال ایسی ہے جیسے زندہ اور مردہ۔ ذکر کرنے والا زندہ ہے اور نہ ذکر کرنے والا مردہ، خواہ تم زندہ سمجھو۔ ذکر اللہ کی بڑی وقعت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تاکید کی ہے۔ جو لمحہ بھی ذکر اللہ میں گزرتا ہے بڑا قیمتی ہے چاہے وہ زبان سے ہو یا دل سے یا روح سے ہو یا سانس سے ہو، کسی قسم سے بھی ہو۔ اللہ کا ذکر باعث نزول رحمت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی و من ذکرنی فی ملا ذکرتہ فی ملا خیر من ملاہ

او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم من تقرب الی شبرا اتقربت الیہ زراعا۔ الحدیث

جوشخص مجھے اپنے دل میں تنہائی میں یاد کرتا ہے میں اس کو دل میں یاد کرتا ہوں اور جوشخص میرا ذکر کسی مجمع میں کرتا ہے تو میں اس سے اچھے مجمع میں یاد کرتا ہوں۔ جب میرا بندہ ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوں اور جو میری قربت چاہتا ہے تو میں اس کے قریب ہوتا ہوں، جوشخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں ایک گز بڑھتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں ذکر کرنے والوں پر بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ بھائیو! عمر کا جو حصہ ملا ہے غنیمت ہے یہاں سے کوچ کرنے کے بعد جتنا بھی ذکر کرو کوئی فائدہ نہیں دیتا۔

میرے بھائیو! اس فرصت کو غنیمت سمجھو اور خدا کا ذکر ہر وقت کرتے رہا کرو، دن رات، اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے کسی وقت غافل نہ رہو، ذکر کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ اور نماز کے اوقات متعین ہیں، بعض وقتوں میں نماز سے روکا گیا ہے، جیسے طلوع غروب اور استواء کا وقت، اسی طرح بلا وضو نماز نہیں پڑھی جاسکتی، مگر خدا کے ذکر کے لئے کوئی وقت معین نہیں ہے اور نہ کسی حالت میں روکا گیا ہے، وضو کے ساتھ ہو یا بلا وضو، ہر حالت میں خدا کا ذکر کرنا جائز ہے۔ اگر غسل واجب ہو تو ذکر اس وقت بھی ممنوع نہیں، اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے۔ صحابہ کرام تجارت بھی کرتے تھے اور زراعت بھی مگر کبھی خدا کے ذکر سے غافل نہیں ہوتے تھے۔

لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ

وہ تجارت بھی کرتے ہیں خرید وفروخت بھی کرتے ہیں۔ مگر یہ چیزیں ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی ہیں، یہی چیز ہم کو بھی کرنا چاہیے، ہر کام انجام دیجئے مگر ذکر ہوتا رہے یہاں تک کہ عادت پڑ جائے، اگر عادت پڑ گئی تو جاگتے، سوتے، بیماری کی حالت میں اور بے ہوشی کی حالت میں بھی ذکر ہوتا رہے گا۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھ کو سب سے زیادہ نفع دینے والی چیز بتلایئے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذکر اللہ کی عادت ڈالو تا کہ مرتے وقت بھی خدا کا ذکر تمہاری زبان پر جاری رہے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ من کان آخر کلامہ لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ وہ شخص ضرور جنت میں داخل ہوگا جس کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہوگا۔

اس کی کوشش کیجئے اور دعا کیجئے کہ خدا ہم تمام حاضرین کا خاتمہ ایمان پر کرے اور ہم کو محشر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور مہربانی نصیب فرمائے۔ اے ہمارے پالنے والے خدا! دین ودنیا کی حاجت پوری کر اور اپنا سچا تابعدار بنا۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

تحریک تجدّد کا پس منظر اور اس کی فکری بنیادیں (۲)

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ

ایک زمانے میں دارالعلوم کے اساتذہ کرام ہر جمعرات کو کسی ضرورت کے موضوع پر اپنا کوئی لکھا ہوا مقالہ اساتذہ اور طلبہ کے اجتماع میں پیش فرماتے تھے، رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے یکم ستمبر ۱۹۶۴ء کے ایک ایسے ہی اجتماع میں اس اہم موضوع پر زیر نظر مقالہ پیش فرمایا تھا، اجتماع کی صدارت حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی۔ افادۂ عام کے لئے اس مقالے کی پہلی قسط ماہنامہ ''وفاق المدارس'' میں پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

سرسید احمد خان:

لیکن اس کے بعد ایک اور شخصیت نے تجدّد کا علم اٹھایا، جس کی ہر دلعزیزی اور عظمت ووقار نے اس تحریک میں خاصی جان ڈال دی، یہ شخصیت ''سرسید احمد خان'' کی تھی۔

سرسید احمد خان ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک شریف اور خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے ابتدا میں خالص روایتی انداز کی دینی تعلیم حاصل کی، مگر ان کی سوانح کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ اپنی عمر کے ابتدائی حصے ہی سے برطانوی حکومت کی طرف مائل اور اس سے متأثر ومرعوب تھے، چنانچہ اکیس سال کی عمر میں انہوں نے برطانوی حکومت کی ملازمت کرلی، جبکہ ان کا پورا خاندان اس کا مخالف تھا، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی تک وہ پوری تندہی کے ساتھ برطانوی حکومت کی خدمات میں مشغول رہے، اور اس عرصے میں انہوں نے ادبی مضامین لکھنے میں اپنا وقت صرف کیا۔

۱۸۵۷ء میں جب مسلمان اپنی عزّت اور آزادی کے دفاع کے لئے انتہائی بیکسی کی حالت میں ایک آخری لڑائی لڑ رہے تھے، انہوں نے اس جنگ آزادی کی پوری مخالفت کر کے حکومتِ برطانیہ کی مدد کی، وہ اپنی کتابوں میں جنگِ آزادی کے مجاہدوں کو ''سرکش'' اور ''نمک حرام'' کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، وہ اس تحریک کے بارے میں مسلمانوں سے کس قدر خفا اور حکومت برطانیہ کے کس قدر مدّاح تھے؟ اس کا اندازہ ان کی ایک ہی کتاب ''سرگذشت سرکشئ بجنور'' سے ہوسکتا ہے، جو حال ہی میں دوبارہ چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے، جنگ آزادی کے بعد سے

۱۸۶۹ء تک ان کی جو مصروفیات تھیں، وہ یہ واضح کرتی ہیں کہ وہ حکومت برطانیہ کے سامنے اس جنگِ آزادی کی معذرت اور اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے جو مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف لڑی تھی، چنانچہ ۱۸۶۰ء میں انہوں نے ''ہندوستان کے وفادار مسلمان'' کے نام سے انگریزی میں ایک کتاب لکھی، جس میں حکومت کے وفادار مسلمانوں کی خدمات کو سراہا گیا تھا۔(Loyal Muhammadans Of India)

اور اسی دوران انہوں نے ''عیسائیت اور اسلام'' کے بنیادی اتحاد پر مضامین لکھے، اور بائبل کی ایک شرح تصنیف کی، جس کے بارے میں پروفیسر اسمتھ نے لکھا ہے کہ اس میں سرسید احمد خان نے اس بات کو ثابت کیا تھا کہ بائبل میں تحریف نہیں ہوئی۔(Modern Islam In India) اسی عرصے میں انہوں نے مختلف مغربی طرز کے اسکول اور انجمنیں قائم کیں،

۱۸۷۰ء میں انہوں نے انگلستان کا دورہ کیا، اس ابتدائی دور میں وہ پہلے مشہور مسلمان تھے، جنہوں نے جزائر برطانیہ کا سفر کیا، وہاں ان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا، لندن کے ممتاز حلقوں میں ان کو اعلیٰ جگہ حاصل ہوئی، وہ بڑی بڑی شاہی دعوتوں میں شریک ہوئے، بینتھم کلب اور دوسری اونچی انجمنوں نے انہیں اپنا اعزازی رکن بنایا، سمٹو میں سوسائٹی آف سول انجینیرس کے عظیم الشان تاریخی جلسے اور ڈنر میں بھی وہ شریک ہوئے جس میں انہوں نے ان ترقیاتی منصوبوں کا مطالعہ کیا جو پورے ہو چکے تھے یا ہو رہے تھے، (ملاحظہ ہو حیات جاوید از حالی چوتھا باب ص: ۱۳۰ تا ۱۴۴)

اس دورے میں انہوں نے مغربی تہذیب کو اپنے اصلی مراکز میں دیکھا، اور اس سے جس بری طرح وہ مرعوب ہوئے اور اس نے ان کی زندگی پر جو اثرات مرتب کئے انہیں ایک مشہور امریکی مستشرق پروفیسر ولفریڈ سی۔ اسمتھ کی زبانی سنیئے، وہ اپنی مشہور کتاب(Modern Islam In India) میں لکھتے ہیں:

> ''ان کی (سرسید کی) زندگی کا تیسرا دور ان کے دورۂ انگلستان سے شروع ہوتا ہے، جبکہ انہوں نے اچانک مغربی تہذیب کو اپنے پورے عروج پر دیکھا، اور اس سے بری طرح مرعوب ہو گئے، اسے دیکھ کر ان کی نگاہیں ایک کمسن بچّے کی طرح چندھیا گئیں، اور پہلے تو وہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر برطانیہ کے آگے ہتھیار ڈالنے پر زور دیتے تھے اب ان کی دلچسپی پورے جوش کے ساتھ مغربی تہذیب میں حصہ دار بننے سے بھی متعلق ہو گئی، انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اب ان کا کام اپنے معاشرے کو صرف برطانوی حکومت قبول کرنے کی ترغیب پر منحصر نہیں رہا، بلکہ انہیں ان کی تہذیب وثقافت اپنانے کی ترغیب بھی دینی ہے۔''

اس دورے کے بعدان کے دل میں صرف مغربی تہذیب کی عظمت ہی پیدانہیں ہوئی، بلکہ اپنے ہم وطنوں کی حقارت بھی پیدا ہوگئی، جیسا کہ ان کے وہ مضامین پتہ دیتے ہیں جوانہوں نے اس دورے کے بعد لکھے، لندن سے ۱۵/اکتوبر ۱۸۶۹ء کوانہوں نے علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے نام ایک خط میں لکھا:

''ہمارے اونچے طبقے ہوں یا نیچے، تعلیم یافتہ یا جاہل، تاجر یا دوکاندار ان سب لوگوں کا جب تعلیم، تہذیب اور نشاط میں انگریزوں سے موازنہ کیا جائے تو انگریزوں کے مقابلے میں یہ گندے جانور معلوم ہوتے ہیں''۔

اور پروفیسر اسمتھ نے ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ:

''اب میں سمجھا ہوں کہ انگریز ہندوستانیوں سے کیوں حقارت کا سلوک کرتے تھے؟ بلکہ اب تو میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ لوگ اس تحقیر کے پورے پورے مستحق تھے''۔

سرسید احمد خان کی زندگی کے مندرجہ بالا واقعات ہم نے قدرے تفصیل سے اس لئے عرض کئے ہیں تا کہ آپ ان کے ذہنی پس منظر میں خوب جھانک کر دیکھ سکیں کہ اس پر مغرب سے مرعوبیت کا کس قدر غیر معمولی احساس پیدا ہو چکا تھا، اور وہ کیا حالات تھے جن کی بناء پر انہوں نے ہندوستان میں تجدّد کی تحریک کو پروان چڑھانے کی کوششیں کیں، آپ نے دیکھا کہ عمر کے اس حصے یعنی دورۂ انگلستان تک انہوں نے اسلام پر کوئی طبع آزمائی نہیں کی، لیکن انگلستان سے واپس آنے کے بعد ان کا ذہن پوری طرح اس بات کا فیصلہ کر چکا تھا کہ ہندوستان میں مغربی تہذیب کو پوری پوری ترقی دینی ہے، لیکن یہاں پھر وہی رکاوٹ ان کے سامنے آتی ہے کہ مغربی فلسفے اور تہذیب کے بہت سے اجزاء اسلامی اصولوں کے خلاف ہیں۔

اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے انہوں نے اس کے بعد ''اسلام'' کے مختلف اصولوں میں ترمیم وتحریف کا سلسلہ شروع کیا، اور انگلستان سے واپس آتے ہی ایک ماہوار رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے جاری کیا، جو تجدّد کے مکتب فکر کا پہلا باقاعدہ ترجمان تھا، اور اس نے اسلام کے بہت سے اصولوں میں ترمیم کرنے والے مضامین شائع کئے گئے، ''پردہ'' کافی الجملہ انکار کیا گیا، کافروں پر ازخود اقدام جنگ کو ناجائز کہا گیا، غلامی کے ممنوع قرار دیدیا گیا، اور اس طرح کی تمام چیزوں میں ترمیم کی گئی جو مغربی تہذیب سے ٹکراتی تھیں، اور اس مقصد کے لئے احادیث کا بھی انکار کرنے سے دریغ نہیں کیا گیا، اس سلسلے میں ایک اور عجیب چیز پروفیسر اسمتھ نے نوٹ کی ہے، اور وہ یہ کہ سرسید احمد خان نے اپنے مضامین میں زیادہ تر مکی آیات سے استدلال کیا، اور مدنی آیات کو جن میں زیادہ تر احکام مذکور ہیں کم سے کم استعمال کیا گیا ہے۔ (ماڈرن اسلام ان انڈیا: ص ۱۴)

اس کے بعد سرسید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور قرآن کی تفسیر پر قلم اٹھایا، اور اس میں بھی جن جن چیزوں پر مغرب نے اعتراضات کئے تھے، ان کو بدل دیا، معجزات کی حسی تاویلات پیش کیں، اور ان کے مافوق الفطرت یا اسباب سے ماوراہونے کا انکار کیا گیا۔

اس دور کے دوسرے متجددین:

اس وقت ہندوستان میں اعلیٰ سوسائٹی کے اندر ایک اچھا خاصا طبقہ وہ موجود تھا جو سرسیّد احمد خان صاحب کی طرح مغربی تہذیب سے مرعوب تھا، اور اس کو اختیار کرنے کے لئے دین ومذہب کی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہتا تھا، جب سرسیّد احمد خان نے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا تو اس کی آرزوئیں برآئیں، اور اس نے اس پرچے کو اپنا فکری پلیٹ فارم بنالیا، اور اس میں سرسیّد خان صاحب کی طرح اسلام میں ترمیم وتحریف کرنے والے مضامین لکھتے رہے.

ان شخصیتوں میں سب سے زیادہ نمایاں مولوی چراغ علی تھے، جنہوں نے اپنے مضامین سے تجدّد کے مکتب فکر کو خاصی تقویت پہنچائی، اور اسلام کی پابندیوں سے آزاد ہونے کے لئے وہی موقف اختیار کیا کہ جو ہم ضیا گوک الپؔ کے تذکرے میں بیان کر چکے ہیں، یعنی یہ کہ اسلام ایک مذہب ہے اور اس کا تعلق محض عبادات ورسوم سے ہے، ان عبادات ورسوم کو بجالانے کے بعد انسان کو اختیار ہے کہ وہ جو تہذیب چاہے اختیار کرے، اور زندگی کے دوسرے مسائل میں جس طرح چاہے عمل کرے، انہوں نے اپنا یہ نظریہ اپنی ایک انگریزی کتاب میں ظاہر کیا ہے جس کا نام ''سلطنت برطانیہ اور دوسری اسلامی ریاستوں میں مجوزہ سیاسی، قانونی اور سماجی اصلاحات'' (Introdution To his book The Proposed Political,Legal and Social Reforms) اس کتاب کا اردو ترجمہ بعد میں ''اعظم الکلام'' کے نام سے شائع ہوا، وہ اس میں ایک جگہ وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

> ''اسلام بحیثیت مذہب کسی سماجی نظام کو اختیار کرنے سے قطعی تعرض نہیں کرتا، اور مسلمانوں کی سیاست اور ان کا سماجی نظام مذہب سے بالکل الگ ہے''

یہ وہی بات ہے جو ضیا گوک الپؔ نے پیش کی تھی، فرق اتنا ہے کہ ضیا گوک الپؔ کو اپنے دعوے کی دلیل میں کوئی آیت قرآنی یا حدیث رسول ﷺ میسر نہ آئی تھی، مگر مولوی چراغ علی صاحب نے کی ''روشن دماغی'' نے اس پر ایک حدیث بھی پیش کردی، ان کا یہ استدلال کس قدر ذہانت پر مبنی ہے؟ ملاحظہ فرمائیے،

آپ نے ''حدیث تأبیر نخل'' کا یہ واقعہ تو ضرور سنا ہوگا کہ مدینہ منورہ میں صحابہ کرامؓ کھجوروں کے درختوں کو بار آور کرنے کے لئے کھجور کے درختوں میں ''تأبیر'' کیا کرتے تھے، آپؐ نے جب سُنا تو انہیں ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا، مگر جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ مدینہ کے عام درخت اس کے بغیر پھل نہیں لاتے، تو آپؐ نے اس کی اجازت دیدی، اور فرمایا کہ: ''أنتم أعلم بأمور دنیاکم'' اپنے دنیوی امور کو تم جانو،

ایک معمولی سوجھ بوجھ والا انسان بھی اس بات کو جانتا ہے کہ جو شخص کسی عہدے پر فائز ہو اس کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک شخصی، اور ایک صاحب عہدہ ہونے کی، فرض کیجئے کہ ایک شخص کسی مملکت کا صدر ہے، اس کی ایک حیثیت صدر ہونے کی ہے، اور ایک حیثیت ایک انسان ہونے کی، صدر ہونے کی حیثیت سے اس کا حکم ہر انسان یہاں تک کہ اس کے باپ کے لئے بھی واجب التسلیم ہے، اور ایک انسان ہونے کی حیثیت سے اگر وہ اپنے باپ بھائی، بیوی بچوں، عزیز واقارب کو کوئی مشورہ دیتا ہے، تو وہ ان کے لئے واجب العمل نہیں اس صورت میں اگر وہ اپنے کسی دوست سے کہتا ہے کہ میں تو تمہارا بھائی ہوں، ضروری نہیں کہ تم میری ہر بات مانو، تو کیا اس کا کوئی عقلمند یہ مطلب لے سکتا ہے کہ اگر وہ قانونی طور پر کوئی حکمنامہ جاری کرے تو بھی وہ ان کے لئے واجب العمل نہ ہوگا؟

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ نکلا اپنی شخصی حیثیت سے جو بات میں کہتا ہوں، وہ تمہارے لئے واجب العمل نہیں، بس یہی مطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا بھی ہے، جسے ہر معمولی سوجھ بوجھ والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے، اور یہی آج تک سب مسلمان سمجھتے آئے ہیں لیکن جب مغربی تہذیب اور رواج کے لئے اسلام کو تہذیب سے جدا کرنے کی سخت ضرورت پیش آئی، اور جناب مولوی چراغ علی صاحب کی نظر اس ارشاد پر پڑی، تو انہوں نے وہ پھڑک اٹھے، یقین فرمالیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد جو دنیوی امور سے متعلق ہو، ہمارے لئے واجب العمل نہیں، خواہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شخصی طور پر فرمایا ہو، یا تشریعی اور قانونی طور سے ع

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے

بہرکیف! یہ ایک مثال ہے اس اجتہاد کی جو یہ حضرات اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانے کے لئے استعمال فرمارہے تھے۔

مولوی چراغ علی صاحب کے علاوہ سید مہدی علی، مصطفیٰ خان اور صلاح الدین خدا بخش صاحبان بھی اس مہم میں کافی پیش پیش رہے، اور انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کی بہر نوع مدد کی،

ایک طرف تو یہ حضرات اسلام کا اس طرح آپریشن کررہے تھے، مگر ڈر تھا کہ عام مسلمانوں کی مخالفت سے کہیں

یہ سلسلہ بند نہ ہوجائے، چنانچہ مغرب کی طرف سے اس عمل پر ان کی خوب پیٹھ ٹھونکی جارہی تھی، پروفیسر ولفریڈ، سی۔ اسمتھ بڑے واضح الفاظ میں اعتراف کرتے ہوئے صلاح الدین خدا بخش کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہم ان کا تذکرہ اس گرمجوشی استقبال کا ذکر کئے بغیر نہیں چھوڑ سکتے جوان کے افکار کو مغرب کی طرف سے عطا کیا گیا، اسلام جدید پر لکھنے والے مصنفین (اوران سے زیادہ عیسائیت کی تبلیغی مشن) یکے بعد دیگرے ان کو خوش آمدید کہتے رہے، انہوں نے اسے اسلامی تجدد کا حرف آخر قرار دیا، اس کی آزاد خیالی کی تعریفیں کر کے اسے آسمان تک پہنچادیا،.....لیکن اس رویّہ کے ذریہ درحقیقت انہوں نے اپنے اس طبقے کا راز افشا کیا ہے جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں''(Modern Islam In India p:3)

کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت رہ جاتی ہے کہ یہ سب کچھ ''در پردہ چشم یار کی شہ پر'' ہورہا تھا؟

تجدّد کا دوسرا دور:

اب تک ہم نے جن متجدّدین کا ذکر کیا ہے، وہ مغربی تہذیب کو قبول کرنے کے جواز میں یہی کہتے آئے کہ اسلام صرف عبادتوں کا نام ہے، دنیا کے دوسرے مسائل میں کوئی تہذیب بھی اختیار کر لی جائے، وہ مزاحمت نہیں کرتا۔

لیکن یہ نظریہ تجدّد کا ابتدائی نظریّہ تھا، اور عام مسلمان اپنے مذہب کی اس قدر تنگ اور محصور کر دینے پر کبھی راضی نہ ہوسکے، عالم اسلام میں ہر جگہ اس نظریہ کی پرزور تردید کی گئی، اور ہر عام وخاص اسے غلط سمجھنے لگا۔

اس موقعہ پر تجدّد کی تحریک کو ایک زبردست خطرہ لاحق ہوا، اور چند ہی دنوں کے بعد متجددین سمجھ چکے تھے کہ ہم نے اسلام کو اس قدر تنگ کر کے اپنے ہی مقصد کو نقصان پہنچایا ہے اور رائے عامّہ اس کے خلاف ہوتی جارہی ہے، چنانچہ ابھی اس نظریئے کو چلے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، کہ اسلام کو عبادات ورسوم تک محدود رکھنے کی آواز بند ہوگئی اور اس کے بجائے ایک اور آواز ابھری، اور اس نے پکار پکار کر لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ وہ کون احمق ہے جو اسلام کو اس قدر تنگ سمجھتا ہے؟ اسلام اس قدر محصور ہرگز نہیں، ہم اسلام کی اس توہین کو برداشت نہیں کرسکتے، اسلام تو ایک بہترین تہذیب وتمدّن کا حامل ہے اور یہ تہذیب وتمدّن بعینہٖ وہ ہے جسے انگریز لے اڑے ہیں، اگر ہم پچھلے کچھ عرصے سے اسے چھوڑ چکے ہیں تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہ تہذیب انگریزوں کی ہوگئی، وہ خالصۃً اسلامی تہذیب ہے، اور ہم اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس ''مغربی تہذیب'' کو اپنانا ہوگا، جو درحقیقت اسلامی تہذیب ہے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یہ پینترا کس خوبصورتی سے بدلا گیا؟ بات وہی رہی کہ مغربی تہذیب کو رواج دو، مگر

کتنے حسین پیرائے میں کہ ع۔۔۔ ''رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی''

چنانچہ ۱۸۹۱ء میں جناب امیر علی صاحب نے Spirit Of Islam کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں نتائج کے اعتبار سے تو وہی نظریات پیش کئے گئے تھے، جو سر سید احمد خان اور مولوی چراغ علی صاحب کے تھے۔ مگر طریق کار میں اختلاف تھا، ''پردے'' کے بارے میں اہل مغرب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ اسلام نے عورت کو پردے کا پابند بنا کر اس کو مقید کر دیا ہے، سر سید اور مولوی چراغ علی صاحب نے فرمایا کہ اسلام نے عورت کو پردے کا حکم مشورے کے طور پر دیا ہے، ورنہ اس کا تعلق تو محض عبادات سے ہے، اور جناب امیر علی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ جو یہ کہتا ہے کہ اسلام نے پردے کا حکم دیا ہے، وہ بھی غلط، اور جو کہتا ہے کہ پردے کے بارے میں کوئی قانونی حکم نہیں دیا، وہ بھی غلط، درحقیقت وہ اسلام ہی تو تھا جس نے عورت کے اوپر سے اور مظالم کی طرح اس پردے کی قید کو بھی اُٹھایا، اور عورت کو پوری طرح آزادی عطا کی، اسلام کی اس بے نظیری سہولت کو اہل مغرب لے اڑے اور کامیاب ہوئے، اور مسلمانوں نے چھوڑ دیا تو قعرِ مذلّت میں جا گرے۔

غلامی کے بارے میں اہل مغرب کا اعتراض تھا کہ اسلام نے اس کو جائز رکھ کر انسانیت کی توہین کی ہے، سر سید صاحب نے اس کا جواب دیا کہ اسلام نے صرف عبادات کے بارے میں ہدایات دی ہیں، حکمرانی کے طریقوں میں ہم خود مختار ہیں، چاہیں قیدیوں کو غلام بنائیں یا چھوڑ دیں، اور جناب امیر علی صاحب نے فرمایا کہ وہ اسلام ہی تو تھا جس نے غلامی کو سختی سے منع کر دیا، اسلام کا یہ حکم اہل مغرب نے اپنا لیا، اور مسلمان اسے جائز سمجھتے رہے۔

غرض ان تمام مسائل میں ٹیپ کا بند تو یہی رہا کہ مغربی طرزِ حیات اپنایا جائے، مگر پہلے تو یہ کہا جاتا تھا کہ اسلام اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں، اب یہ کہا جانے لگا کہ وہ اس کی ترغیب دیتا ہے، اور یہی اس کے اصلی اصول ہیں۔

امیر علی صاحب کی یہ ماہرانہ تکنیک تجدّد پسند طبقوں میں بیحد مقبول ہوئی، اور پھر اسی نظریئے کو بنیاد بنا کر مضامین لکھے جانے لگے، اہل مغرب نے بھی اس طریقے کو خوب سراہا مگر، امیر علی صاحب میں مستشرقین کے نزدیک ایک خامی تھی جس سے انہیں خطرہ لاحق تھا، اور وہ یہ کہ امیر علی صاحب حدیث کو حجت تسلیم کرتے تھے، اور حدیث کو حجت تسلیم کرتے ہوئے مغربی تہذیب کو سو فی صد اسلامی تہذیب کہنا بڑے دل گردے کا کام تھا، اس لئے خطرہ تھا کہ یہ تحریک بھی کہیں جلدی فیل نہ ہو جائے، یہ خطرہ مستشرقین کے دل میں کس بری طرح دھڑک رہا تھا؟ اس کا اندازہ پروفیسر کنٹول اسمتھ کی مندرجہ ذیل عبارت سے ہوگا جو انہوں نے امیر علی صاحب پر تبصرہ کرتے

ہوئے لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

ان لوگوں نے اسلام کو عقلیت پسند ثابت کرنے کے لئے تو قرآن اور حدیث کے طول طویل اقتباسات جی کھول کر پیش کئے، مگر خود قرآن اور حدیث کو عقلیت پسندانہ تنقید کا موضوع کبھی نہیں بنایا، (Morden Islam In India p:60)

مستشرقین کا یہ خطرہ سو فی صد درست نکلا، اور جب یہ بات کچھ چلتی ہوئی نظر نہ آئی تو فوراً ہی تجدّد کی تحریک ایک تیسرے مرحلے میں داخل ہوگئی۔

تیسرا دور: اس مرحلے میں اسلام کو ایک مکمل تہذیب کا حامل بھی کہا گیا، اور اس کی اصل تہذیب وہی قرار دی گئی جو مغرب میں رائج تھی، مگر اس ''قرارداد'' کی سہولت کے لئے حدیث کو حجت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا، اور اس طرح مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کا نمائندہ قرار دینے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ تھی، وہ دور ہوگئی، اتنا فرق ضرور ہوا کہ پروفیسر اسمتھ صاحب نے تو قرآن وحدیث دونوں کو علی الاعلان عقلیت پسندانہ تنقید کا موضوع بنانے کا مشورہ دیا تھا، مگر ذہین اور زیرک متجدّدین نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا کہ اس سے دونوں کام بھی ہوگئے، اور قرآن کو رد کرنے کی بدنامی بھی مول نہ لینی پڑی، ظاہر ہے کہ اگر قرآن کو علی الاعلان تنقید کا ہدف بنایا جاتا تو امت مسلمہ میں کوئی جاہل سے جاہل انسان بھی ان کی بات سننے کا روادار نہ ہوگا، انہوں نے اعلان تو بڑے زور وشور سے ''حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ'' کا کیا، مگر کھلی ہوئی بات ہے کہ حدیث سے قطع نظر کرنے کے بعد قرآن کو ماننے یا نہ ماننے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، پھر قرآن کریم میں تاویل وتحریف کا ایک کھلا میدان ہاتھ آجاتا ہے، اس کو جو معنی دل میں آئیں پہنائے جاسکتے ہیں، خصوصیت سے جب ایک نئی ''لغات القرآن'' بھی تصنیف ہوچکی ہو، لہٰذا ان حضرات کی پوری توجہ انکارِ حدیث پر مبذول رہی، اور اپنے ہر مضمون میں قرآن کی سینکڑوں آیتیں ذکر کرکر کے یہ باور کرایا جاتا رہا کہ دیکھو ہم قرآن کریم کے کس قدر عاشق اور شیدائی ہیں؟

انکارِ حدیث کی یہ تحریک بھی کئی مرحلوں سے گذر کر ''ادارۂ طلوع اسلام'' کے باقاعدہ منظم مکتب فکر تک پہنچ گئی۔

ایک عرصہ دراز تک ''طلوع اسلام'' کی یہ تحریک ناواقف یا آزادی کے خواہاں لوگوں میں خاصی کامیاب ہوتی رہی، اور اس کی نظر فریب تحریریں اسے دین کا سچّا خادم باور کراتی رہیں، لیکن بالآخر جب علمائے کرام اور دوسرے مسلمانوں نے اس فتنے کی پوری حقیقت بھی واضح کردی، تو اس کی دلکشی کا طلسم ٹوٹنے لگا، اور مسلمانوں پر یہ بات کھلنے لگی کہ حدیث کا انکار کرنے کے بعد دین ودانش کا حلیہ کس بری طرح بگڑ جاتا ہے، ''تجدد'' کے وکلاء کو حدیث کا

انکار کر کے بھی خاطر خواہ کامیابی محسوس نہ ہوئی۔

اس مرحلے پر تجدّد کے مکتب فکر کو تحریف وترمیم کی مشق کرتے ہوئے پوری ایک صدی گذر چکی تھی، اس عرصے میں تحریف کے نئے نئے رُخ اور نئے نئے طریقے ان کے سامنے آئے تھے، یہاں تک کہ آپریشن کے اس عمل میں خاصی صفائی پیدا ہو چکی تھی، اس لئے اس مرحلے پر پہنچنے کے بعد دوبارہ جناب امیر علی صاحب کی سطح پر آجانے میں زیادہ دشواری نہ تھی، اب ''تحریف'' کا عمل اتنا ترقی کر چکا تھا کہ حدیث وسنت کو حجت تسلیم کر لینے کے بعد بھی وہ اپنی چابک دستیوں سے من مانے نظریات کو اسلام کے سر تھوپ سکتا تھا، چنانچہ اس مرحلے پر پہنچ کر ''تجدد'' کی تاریخ ایک چوتھے موڑ پر پہنچ گئی۔

تجدّد کا چوتھا دور:

اب مغرب پسند حلقوں نے ایک نیا موقف اختیار کر لیا، اور وہ یہ کہ قرآن وحدیث دونوں کو بحیثیت مجموعی تو حجت تسلیم کر لیا، مگر جو حدیث اپنے کسی مزعومے کے خلاف گئی اُس میں یا تو تحریف کا وہی عمل کیا جس میں اب تک خاصی مہارت پیدا ہو چکی تھی، یا اگر وہ اتنی صریح ہوئی کہ تحریف ممکن نظر نہ آئی، تو سند کا ضعف دکھا کر، یا معارضہ پیدا کر کے، یا قرآن یا عقل کے خلاف کہہ کر اس کو رد کر دیا۔

اس کام کیلئے ایک دوسرے کی ہمت بندھانے اور ''من ترا حاجی بگویم'' کی ضرورت تھی، اس لئے اس مقصد کے لئے لاہور میں ایک ادارہ ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' کے نام سے قائم کیا گیا، جس کی طرف سے ایک ماہنامہ ''ثقافت'' اب بھی جاری ہے، اور بہت سی کتابیں ٹھیک انہی موضوعات پر وہی بات ثابت کرنے کے لئے لکھی گئیں جو سرسید یا دوسرے متجدّدین کہا کرتے تھے، تعدد ازواج کو ممنوع کہا گیا، سُود، موسیقی، اور ضبط ولادت کے جواز پر فتوے دیئے گئے، تصویر اور فوٹو گرافی کی کھلی چھٹی دیدی گئی، پردہ کقول اکثر عورتوں کے چہروں سے اٹھا کر اپنی نگاہوں پر ڈال لیا گیا، غرض تمام وہ باتیں دہرائی گئیں جو منکرین حدیث کہتے تھے، یا سرسید نے ارشاد فرمائی تھیں۔

لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ اس طبقے سے پہلے جن متجدّدین نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا تھا وہ پوری اخلاقی جرأت اور وضاحت کے ساتھ علی الاعلان کہتے تھے کہ ہمیں مغربی تہذیب محبوب ہے، ہم اسے اپنے معاشرے میں سمونا چاہتے ہیں، مگر یہ حضرات اس جرأت کا ثبوت بھی نہ دے سکے، یہ ہر موقعہ پر دعویٰ یہ بھی کرتے تھے کہ ہم مغربی تہذیب کے اندھے مقلّد نہیں ہیں، ہمیں اس کی بہت سی خرابیوں کا علم ہے، وہاں کا معاشرہ اس تہذیب کی بدولت جن پستیوں میں جا گرا ہے ان سے بھی ہم واقف ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ان تمام لعنتوں کی تائید بھی کرتے تھے کہ

جن کی بدولت مغربی تہذیب پر یہ عذاب مسلّط ہوا، گویا وہ بہ زبان حال یہ اقرار کرتے تھے کہ ہمیں عقلی طور پر وہ خرابیاں تسلیم جو مغربی تہذیب کی بدولت پیدا ہوتی ہیں، مگر ع۔۔۔ ''اپنی نظر کو کیا کروں، مجھ کو تو وہ پسند ہیں''

اس ادارے کے نمایاں افراد میں سے ایک صاحب تو خلیفہ عبدالحکیم تھے، جنہوں نے آخر میں کھلے انکار حدیث کے موقف کے بجائے یہ موقف اختیار کرلیا تھا، دوسرے جناب جعفر شاہ صاحب پھلواروی، مؤخر الذکر کے بہت سے مضامین اس ادارے نے شائع کئے، اور خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی، آخر الذکر کے کئی مضامین پڑھنے کا احقر کو اتفاق ہوا، جن میں سے بعض پر تحریری تنقید شائع بھی ہوچکی ہے،

اس طبقے کے استدلال کتنے جاندار اور وقیع ہوتے ہیں؟ اس کا تفصیلی انداز تو آپ کو اسی وقت ہوگا جب ایک ایک مسئلے پر تفصیلی گفتگو کی جائیگی نمونہ کے طور پر ایک مثال ملاحظہ ہو، جناب جعفر شاہ صاحب پھلواروی کمیونزم کے نظریہ کی تائید کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ شریعت نے زمینوں کو کسی کی ملکیت نہیں بنایا، بلکہ وہ قوم کی ملکیت ہیں، اور عارضی طور سے استعمال کے لئے وہ جسے چاہے دیدیتی ہے، اپنے اس دعوے پر جس کی تردید میں قرآن وحدیث بھرے ہوئے ہیں، وہ ایک بڑا دلچسپ استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''جُعلت لی الأرض کلّها مسجداً'' یعنی میرے لئے تمام زمین کو مسجد بنادیا گیا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ مسجد کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی، جب پوری زمین مسجد ہے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ زمین کسی کی شخصی جاگیر نہیں بن سکتی''

ہمارے خیال میں اس استدلال پر کسی تبصرے کی حاجت نہیں، بہرحال اس طبقے کی دلیلیں اس طرز کی ہوتی ہیں۔ اس لئے خطرہ تھا کہ اس عظیم الشان کام کو انجام دینے کے لئے اسی قسم کی دلیلیں پیش کی جاتی رہیں، تو پھر اس طبقے کا بھرم نہ کھل جائے، دوسری طرف اب ہر طریقہ آزمایا جاچکا تھا، حدیث سے انکار کرنے کا بھی، اور اسے تسلیم کرنے کا بھی، انکار حدیث کا حلقہ اثر روز بروز گھٹ رہا تھا، یہاں تک کہ ایک زبردست واقع نے اس کی گرتی ہوئی عمارت پر آخری ضرب لگادی، یہ آخری ضرب تمام مکاتب فکر کے علماء کا متفقہ فتویٰ تھا جس میں ہر فرقے کے علماء نے بلا اختلاف انکار حدیث کے مکتب فکر کو خارج از اسلام اور کافر قرار دیدیا تھا، اس ضرب کے بعد انکار حدیث کا عوام میں جو رہا سہا اعتماد تھا، وہ بھی فنا ہوگیا۔ اس لئے اب دوبارہ انکار حدیث کے ذریعے مطلب برآری ممکن نہ تھی، اور ضرورت ایسے لوگوں کی تھی جو حدیث وقرآن دونوں کو ماننے کے ساتھ ایسے استدلال پیش کرسکیں جو پیش کرتے ہی نہ کھل جائیں، کم از کم ناواقف طبقہ اس سے متأثر ہوسکے، اس کام کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ایسے انسان ملیں جنہوں نے براہِ راست میکگل یونیورسٹی سے فیض حاصل کیا ہو، اور مستشرقین کے

افکاراورطرزفکرکووہ پوری طرح اپناسکتے ہوں۔

کوئی شک نہیں کہ اس معیار پر جس شخصیت کا انتخاب کیا گیا، وہ ہر حیثیت سے اس کام کی لائق تھی، یہ جناب ڈاکٹرفضل الرحمن صاحب کی باوقار شخصیت تھی جنہوں نے اسلامی علوم براہِ راست یہودی مستشرقین سے میکگل یونیورسٹی میں حاصل فرمائے تھے، چنانچہ کسی تأمل کے بغیر ۱۹۵۹ء میں کراچی کے اندر ''مرکز اسلامی تحقیقاتی ادارہ'' کے نام سے ایک مرکز قائم ہوا، جس نے تجدّد کے کام کا بیڑا اٹھایا، اوراس مقصد کے لئے چار پرچے جاری کئے دوانگریزی میں، ایک سہ ماہی Islamic Studies اوردوسرا ماہنامہ Ummah، ایک بنگلہ میں بنام ''سندھان'' اور پھرایک اردو میں بنام ''فکرونظر''۔ جناب ڈاکٹرصاحب موصوف نے پاکستان تشریف لانے کے بعد اپنے آپ کو تجدّد اورقدامت پسندی دونوں سے غیر جانبدار رکھنے کا اعلان فرمایا، بلکہ گذشتہ متجدّدین پر تنقید بھی فرمائی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ان سے متفق نہیں ہوں گے، چنانچہ ۱۹۵۷ء میں لاہور کے اندر جو اسلامی مذاکرہ ہوا تھا، اس میں مقالہ پڑھتے ہوئے جناب ڈاکٹرصاحب نے تحریک تجدّد کی ناکامی کے اسباب بیان کئے اورفرمایا:

''آزادمنش جدّت پسندوں نے اس قدردیوانہ واراوراتنے فیصلہ کن انداز میں مغرب کی معاشرتی واخلاقی اقدارکواسلام سے اس قدرہم آہنگ کرنے کی کوشش کی کہ پوری طرح اس بات کی وضاحت کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کہ انہیں کیوں اپنانا چاہئے؟''

پھراپنے اس خیال کی بار بارتاکید بھی فرماتے رہے، چنانچہ ماہنامہ فکرونظر کے اگست ۶۴ء کے شمارے میں تحریرفرماتے ہیں:

''قدامت پسندحضرات قرون وسطی کے نظریات کی رو سے اسلام کی تشریح کرتے ہیں، لیکن جدّت پسند اصحاب ان نظریات کے بجائے نئی توضیحات لاتے ہیں''۔(ص۹)

آگےتحریرفرماتے ہیں:

''لیکن جدت پسند بھی اسلام کا کوئی نیاترقیاتی خاکہ نہیں پیش کرتے، ان کی جدوجہد منفی سمت میں ہوتی ہے، وہ اسلام کوعلیحدہ یاغیرمؤثر رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ اسلام ترقی کی راہ میں حائل نہ ہو ان کا خیال ہے کہ اسلامی حدود سے باہررہ کرہی ترقی کی منزلیں طے کی جاسکتی ہیں، اس طرح ایک اقل اسلام کا تصوران کے سامنے آتا ہے جس سے انہیں عارضی تسلّی تومل جاتی ہے لیکن یہ لادینیت کا دوسرا نام ہوتا ہے'' (ایضا)

اس قسم کی تحریروں سے یہ باورکرانا مقصود ہے کہ انہیں جدّت پسند گروہ کے معروف طبقے میں شامل نہ سمجھا

جائے، وہ غیر جانبدار رہیں گے۔لیکن ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ اگر انہیں جدت پسندوں کی اندھی تقلید مغرب پسند نہیں ہیں تو جن مسائل میں جدت پسندوں نے اس اندھی تقلید کا مظاہرہ کیا ہے، اس میں ڈاکٹر صاحب ان سے اختلاف کیوں نہیں فرماتے؟ ادارۂ تحقیقات اسلامی کے جس قدر کارنامے اب تک منظر عام پر آئے ہیں، وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ دیکھو ہم میں اور قدیم متجددین کے کارناموں میں کوئی فرق نہیں، انہوں نے مغرب کی تقلید میں سود کو جائز کہا تھا،، ہم بھی کہتے ہیں، انہوں نے مغرب کی تقلید میں تعدد ازواج ممنوع کیا تھا، ہم بھی کرتے ہیں، وہ پردے کو غیر شرعی قرار دیتے تھے، ہم بھی قرار دیتے ہیں، جن جن چیزوں میں وہ مغرب کی تقلید کرتے تھے، ہم بھی ان سے پیچھے نہیں، پھر وہ کیا فرق ہے جس کی بناء پر جناب ڈاکٹر صاحب کو پرانے جدت پسندوں سے ممتاز کیا جائے؟

اس صورت میں جناب ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ قدیم جدّت پسندوں نے اندھی تقلید کی تھی، اس کے سوا اور کیا مطلب رکھتا ہے کہ انہوں نے تو مغربی نظام کو تقلیداً اپنایا تھا، لیکن ہم نے اسے تحقیقاً اپنایا ہے؟ کیا اس سے یہی تأثر پیدا کرنا منظور نہیں کہ کتنی ہی تحقیق کر لی جائے، مغربی نظام ہر قدم پر واجب التسلیم ثابت ہوتا ہے۔

بہر کیف! یہ طرز عمل واضح کر دیتا ہے کہ موجودہ موقف سابقہ طرز ہائے استدلال کی ناکامی کے بعد یہ تأثر دینے کے لئے اپنایا گیا ہے کہ قرآن وسنت پر مبنی تحقیقات بھی مغربی تہذیب کے حق میں ووٹ دیتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب حدیث کا علی الاعلان انکار نہیں کرتے، ان کے مضامین میں قرآن کی آیتیں، حدیثیں اور بڑی بڑی کتابوں کے بیشمار حوالے بھی نظر آتے ہیں، لیکن ان کے مضامین کا ایک گہرا تجزیہ ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ ان کا انداز بیان، کچھ اس قدر ژولیدہ، الجھا ہو، اور مستشرقانہ ہوتا ہے کہ ایک عام آدمی ان کے مضمون میں بیشمار حوالے دیکھ کر ان کے انداز تحقیق سے مرعوب تو ہو جاتا ہے، مگر اس کے پلّے کچھ نہیں پڑتا، وہ اس الجھے ہوئے مضمون کو پورا پڑھنے پر قادر ہی نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے ذہن پر یہ تأثر قائم ہو جاتا ہے کہ اس قدر تحقیقی مضمون جو میری فہم سے بالا ہے، ضرور وزنی ہوگا، اور اس میں ناقابل انکار دلائل ہوں گے، اس لئے وہ دلائل کو پرکھے بغیر ہی اس سے متأثر ہو جاتا ہے۔

اور ایک اہل علم اگر دل پر جبر کر کے اس مقالے کو پورا پڑھ لے تو بہت غور وفکر کے بعد وہ ان کا دعویٰ تو شاید سمجھ جائے، لیکن اس کی مرتّب اور منظم دلیلوں کا متعین کرنا سخت مشکل ہے، پورے مقالے میں جو مواد بکھرا ہوا ہے، اس میں بہت کم باتیں اصل دعوے سے متعلق ہوتی ہیں۔ یہ تھا تحریک تجدد کا ایک تاریخی جائزہ، اور اس کے فکری ارتقاء کا ایک مطالعہ۔(باقی آئندہ)

جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا؟!

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی

زبان دیکھنے میں انسانی جسم کا ایک بہت چھوٹا سا اور کمزور اعضاء میں سے ایک عضو ہے، مگر یہ چھوٹا عضو انسان کی ذات، شخصیت، علم وکمالات، فکر ودماغ اور نظریات وتعلیمات کی ترجمانی اور اس کی تاثیر میں دنیا کی سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام خطوں، ملکوں اور علاقوں میں اس زبان کی ایک طاقتور کارفرمائی ہر وقت، ہر ایک فرد بشر کے سامنے رہتی ہے۔ اس کی عالمگیری، جہاں گیری کی انتہا ہے اور نہ طاقت وترجمانی کی، اور اس سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اگرچہ دنیا میں ہزار ہا ہزار زبانیں موجود ہیں، جو بولی جاتی ہیں، سمجھی جاتی ہیں، مگر ان کی نمائندگی وترجمانی کے لئے کوئی تحریری پیرہن موجود نہیں، نہ ان کو کسی بھی صورت لکھا جا سکتا۔ نہ پڑھا جا سکتا ہے، جو کچھ ہے، سب زبانی ہے، اس سے آگے کچھ نہیں، مگر ان ہزار ہا ہزار زبانوں میں سے گنتی کی چند زبانیں ایسی ہیں کہ جن کا تحریری پیرہن بھی بہت عمدہ ہے، اور تعبیر وترجمانی بھی اعلیٰ درجہ کی ہے، ان زبانوں میں بڑے سے بڑے خیال کی، اہم سے اہم فکر ونظریات کی عمدہ سے عمدہ تعبیر نہ صرف ممکن ہے، بلکہ ہزاروں سال سے اس کے ایک سے ایک بہتر، ایک سے ایک عمدہ بلکہ یادگارِ زمانہ، بے نظیر وبے مثال نمونے سامنے آتے رہے اور آتے رہتے ہیں۔

یہ وہ زبانیں ہیں، جن کو حق تعالیٰ شانہ نے قوت اظہار وبیان اور تلقی وترقی ونمو سے نوازا ہے، ہر وقت ان کی تحریرات اور ان میں تصنیف وشاعری کے اسالیب کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، نئی نئی باتیں اور ایسے ایسے خیالات وتصورات ان کے ذریعہ سے پیش کئے اور قلم بند کئے جاتے ہیں، کہ جن میں سے بعض شہ پاروں کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں، اور پوری دنیا میں ان کی پذیرائی اور استقبال ہوتا رہتا ہے اور وہ بعض قوموں وملکوں کی شان اور ان کی پہچان بن جاتے ہیں، کہ جن میں سے بعض اس درجہ کے ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑے صاحب علم وفن اور بڑے سے بڑے لکھنے پڑھنے والے، اس کو پڑھ کر حیران رہ جاتے ہیں اور کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ اس تحریر، اس کلام اور اس شاعری کی مثال ممکن نہیں، یہ تو معجز بیانی ہے، لیکن پھر کوئی خدا کا بندہ نمودار ہوتا ہے اور ان تمام پرانی چیزوں سے آگے بڑھ کر کچھ لکھ دیتا ہے یا کہہ دیتا ہے، پھر اس کو ساری دنیا میں پڑھا جاتا ہے، اس کے ترجمے ہوتے ہیں، اور اس کو ایک نمونہ اور مثال بنالیا جاتا ہے، یہ ایک بہت لمبا سلسلہ ہے، جو کئی زبانوں کے ساتھ جاری ہے، اور ہمیشہ

جاری و باقی رہے گا لیکن اس میں ایک بات جس سے کبھی بھی غفلت و ذھول ہو جاتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس قدر بھی عالمی تحریری زبانیں ہیں، ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک سانچہ، ایک ترتیبِ قواعد اور ایسے خاص الفاظ ہوتے ہیں کہ جو زبان کا جوہر شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی دوسری زبان ولغات میں ترجمانی اور تعبیر تو ممکن ہے اور یہ ہمیشہ ہوتی بھی ہے لیکن ان کے الفاظ کو دوسری زبان کی تعبیر اور اس کے بنیادی نظام کو تباہ اور ختم کرنے کے لئے لکھنے اور استعمال کرنے کا کوئی تک، کوئی معقولیت اور کوئی جواز نہیں۔ اس بے ڈھنگی تعبیر اور ترجمانی کا ہمارے قریب کے ماضی اور حال میں اچھا خاصا مگر غلط اور بے محل استعمال خوب نظر آ رہا ہے، جس پر پابندی لگانے اور اس سے بچنے اور احتیاط کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔

اس وقت دنیا میں جو زبانیں عالمی حیثیت رکھتی ہیں، اور ان کی بہت زیادہ پذیرائی بھی ہے، ہر طرح سے ان کا استعمال و استقبال بھی! وہ عربی و انگریزی ہیں، اگرچہ فرانسیسی، جرمن، عبرانی، چینی اور فارسی زبانیں بھی افق عالم پر خوب تابندہ وجلوہ گر ہیں، اور ان کا اپنا ایک جہانِ تحریر وعمل ہے، لیکن پوری ملت اسلامیہ کے لئے سب سے زیادہ قابل توجہ، لائق احترام اور دین کے تمام کاموں کے لئے رہنما و بنیادی معلم زبان، عربی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ پچھلے ڈیڑھ سو سال سے خصوصاً انگریزوں اور ان کے علاوہ بھی جو اسلام دشمن قوتیں کارفرما ہیں، انہوں نے اجتماعی طور پر منصوبے بنا کر مسلمانوں کو اس زبان سے، اس کی تعبیرات سے دور کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش و روش سے ہماری تحریر وتصنیف کی زبان بہت زیادہ متاثر ہوئی اور اس نے کم از کم عربی مبین کی راہ سے جس کو قرآن کریم نے بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ فرمایا ہے، ہٹانے اور منحرف کرنے کی کوشش کی۔

یہ کوششیں سب سے زیادہ انگریزی اور فرانسیسی زبان کے حوالہ سے ہوئیں، ان دونوں زبانوں کے بے شمار الفاظ کو بہت معمولی ترمیم وتغیر کے ساتھ، عربی زبان کا حصہ بنا دینے کا ایک لمبا منصوبہ اور گہری سازش یا اسکیم عمل میں لائی گئی، کہ بڑے بڑے اہل قلم مصنفین، ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کے ذریعہ عربی کے عمدہ خوبصورت اور کثیر الجہات شاندار معانی کو ترک کر کے، ان زبانوں کے الفاظ کو معرب کر کے، عربی تحریروں میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔

یہ کوشش اور سازش کسی ایک ادارہ یا چند افراد کی نہیں تھی، بلکہ اس کے پیچھے ایک بڑا نظریہ اور فلسفہ کارفرما تھا کہ ملت اسلامیہ کو قرآن کریم اور احادیث نبویہ شریفہ کے پُر بہار، کثیر المعانی، کثیر البرکات الفاظ سے محروم اور دور کر کے، ان کی جگہ اپنی زبانوں کے الفاظ اس طرح شامل کئے جائیں کہ وحی الٰہی سے وابستہ الفاظ اور نور نبوت سے پُر فیض تعبیرات وکلمات، ہمارے ذہنوں اور تحریرات سے بالکل نکل جائیں اور یہ یاد ہی نہ رہے کہ

کیا لفظ تھا؟، اس کا کیا پس منظر تھا؟ اور اس کی کیا آفاقیت ومعنویت تھی؟۔۔۔ یہ بات یہاں تک بڑھی کہ سینکڑوں سے زیادہ الفاظ ہماری عربی مبین میں داخل کر دیے گئے، عربی کے الفاظ خارج کر کے ان کو چلایا گیا، جس سے صحیح عربی کا ذوق بھی متاثر ہوا اور قرآن کریم کی زبان ہونے کی وجہ سے عربی کے اندر جو ایک خاص جاذبیت، کشش اور قوت وتاثیر تھی، اس پر بھی ضرب لگانے کی تدبیر کی گئی، جس کو کسی بھی پہلو سے اچھا نہیں سمجھا جاسکتا اور نہ سمجھنا چاہئے۔

کسی بھی زبان کے مفید اور صحیح الفاظ کو کسی دوسری زبان میں شامل کر لینا بری بات نہیں ہے اور یہ عمل وطریقہ ہزاروں سال سے جاری ہے، لیکن ایک منصوبہ بنا کر خاص مقاصد کے لئے عربی زبان کو متاثر وتباہ کرنا اور اس کی جو بلند تعبیرات اور عربی مبین کی معنویت وصفات ہیں، ان کو متاثر ومتغیر کرنے کی منصوبہ بندی کسی بھی صورت اور کبھی بھی پسندیدہ نہیں کہی جاسکتی، اس سے احتیاط واحتراز بہت ضروری ہے، جن لوگوں نے اس سازش کو عملی شکل دی، اس کو آگے بڑھایا اور پھیلایا، انہوں نے ایسی ہوشیاری برتی اور ایسی باریک چالیں چلیں، کہ امت کے بڑے بڑے اہل علم، اہل قلم، مشاہیر، صلحاء اور مفکرین اساتذہ بھی غیر محسوس طریقہ پر اس کا شکار ہوتے چلے گئے، جس کا دوہرا نقصان ہوا۔

عربی مبین کمزور اور اجنبی ہوتی گئی اور فرنگی زبان کے یہ الفاظ وتعبیرات ہماری تحریرات وفکر میں داخل ہوتی گئیں، جس کا ہماری تہذیب اور ہماری زندگی پر بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا اور ہو رہا ہے، ایسے الفاظ پر توجہ اور ان کی اصلاح کی کوشش ہر پہلو سے نہایت ضروری ہے اور یہ کوشش پہلی بار نہیں ہو رہی، اس سے پہلے متعدد علماء اس پر کم زیادہ توجہ دلا چکے ہیں، مثلاً جب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے کراچی سے المنجد کا اردو ترجمہ شائع کرایا تھا، اس وقت اس پر ایک مفصل اردو مقدمہ بھی لکھا تھا اور ایسے چند الفاظ کی واضح نشاندہی اور تردید کی تھی، جن میں صاحب المنجد نے معنوی تحریفات کی تھیں اور اسلامی، شرعی الفاظ کے معانی میں ترمیم وتغیر کیا تھا۔ (مقدمہ المنجد اردو ص: ۷ تا ص: ۳۱/ کراچی۔ نومبر ۱۹۶۷ء)

اسی طرح اب جب بھی ایسا کام ہو کہ جس کی زد عربی مبین پر پڑتی ہو تو اس کی تردید تو واجب ہے۔

ضرورت تھی کہ اس گہری مگر بظاہر غیر محسوس سازش کا پردہ چاک کیا جائے بلسان عربی مبین کی ترجمانی و تعبیرات کو پھر سامنے لایا جائے اور جو انگریزی تعبیرات عربی میں شامل کر دی گئیں اور کی جارہی ہیں، اس کی ایسی نشاندہی ہو کہ ہمارے اس دور کے پڑھنے والے اور آئندہ آنے والے ان سے بچیں اور احتیاط کی کوشش کریں اور پھر اپنی اسی صراط قویم اور جادۂ مستقیم پر آجائیں، جس کا ان الفاظ میں ارشاد وتذکرہ ہوا ہے:

احبوا العرب لثلاث، لأني عربي والقرآن عربي وكلام أهل الجنة عربي (رواه الطبراني والحاكم والبيهقي)،،
ہماری فلاح وکامیابی، عربی مبین سے وابستگی میں ہے اور زبانوں کا جاننا، پڑھنا، سیکھنا پسندیدہ ہے، ان پر بھی پوری توجہ ہونی چاہیے اور ان سے ہر طرح فائدہ بھی اٹھانا چاہیے، لیکن ان کی قیمت پر عربی زبان کو تباہ یا خراب کرنے کا کوئی تک اور جواز نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اصل کی طرف رجوع کریں اور صاف صاف اعلان کردیں کہ:

ہوتا ہے جادہ پیماں پھر کارواں ہمارا

مولانا ہدایت اللہ آسامی صاحب نے اپنی تازہ تالیف ''عربی حروف میں فرنگی زبان'' میں اس پہلو پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے اور عربی مبین کی بہترین وکالت، نمائندگی اور ترجمانی کی ہے۔ یقیناً مولانا کی بعض باتوں سے اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن اس کتاب کا جو اصل پیغام ہے اور اس میں جس گہرائی، وسعت مطالعہ، توجہ اور مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کے ساتھ اس موضوع کا احاطہ کیا ہے، وہ یقیناً بہت عمدہ، مفید اور رہنما تالیف ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور خاص طور سے عربی زبان کے طالب علموں کو، اس کتاب کو سمجھنے، پڑھنے اور اس کی روشنی میں اور اس عربی کی روشنی میں جو کتاب اللہ کی ہے، جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، جو حضرات صحابہ کی ہے، جو ہمارے قدیم علماء کی ہے، اس کا احیاء واجراء کریں۔

میرے خیال میں اس میں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ کس نے کیا کہا، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا کہا گیا اور کیا صحیح ہے۔ ہمارے یہاں ایک بنیادی اصول اور ہدایت یہ ہے کہ:

أُنظر إلى ما قال و لا تنظر إلى من قال

اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے، غلطی چھوٹوں سے نہیں بڑوں سے بھی ہوسکتی ہے اور بڑوں کی غلطی زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے، اس میں ناراض ہونے اور بلاوجہ تقلید سلف نہ کرنی چاہیے، صحیح کی تلاش اور اس کا کل اتباع بہرحال ضروری ہے۔ میں یہ کہہ کر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

آیئے! متونِ احادیث کی کتب کا مطالعہ کریں

مولانا محمد طارق تونسوی

درسِ نظامی کی تکمیل کے سفر میں طالبِ علم مختلف کتبِ احادیث کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتا ہے، اور اس کے قلب و ذہن پر انوارِ نبوت کی کرنیں پڑنے لگتی ہیں۔ یہ مرحلہ علمی و روحانی بالیدگی کا ایک حسین دور ہوتا ہے، جہاں الفاظ محض معلومات نہیں رہتے بلکہ تاثیر بن کر دل میں اترتے ہیں۔

درسِ نظامی کے نصاب میں عموماً صحاحِ ستہ، موطا امام مالک اور طحاوی شریف کے منتخب ابواب کی تدریس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتب یقیناً علومِ حدیث کا مضبوط سرمایہ ہیں اور ان کے ذریعے طلبہ کو اس فن کے اصول و مبادی سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ تاہم، اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ حدیث کی دنیا ان چند متون تک محدود نہیں، بلکہ اس کا دامن نہایت وسیع اور ہمہ گیر ہے، جس میں بے شمار ایسی کتب شامل ہیں جو علمی و فکری گہرائی، استنباطی بصیرت اور روحانی بالیدگی کا خزانہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

یہ ہماری علمی و دینی ذمہ داری ہے کہ جن کتبِ احادیث کے حوالے ہم اپنی درسی اور تحقیقی زندگی میں بارہا سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں، کم از کم ایک مرتبہ خود ان کا براہِ راست مطالعہ ضرور کریں۔ مثلاً مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ، اور مصنف عبدالرزاق جیسی عظیم الشان تصانیف محض حوالہ جاتی کتب نہیں، بلکہ اپنے اندر علم و حکمت کے بے بہا خزانے سموئے ہوئے ہیں۔ یہ کتب وہ روشن چراغ ہیں جن کی روشنی میں محدثین نے صدیوں تک علمِ حدیث کی راہوں کو منور رکھا۔ ان کے اوراق میں صرف احادیث کا ذخیرہ ہی نہیں، بلکہ اسلاف کی علمی محنت، فقہی بصیرت اور دینی فہم کی جھلک بھی نمایاں ہوتی ہے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر ان کے نام تو بڑے شوق سے لیتے ہیں، ان کے حوالے اپنی تحریروں میں نقل کرتے ہیں، لیکن خود ان کتب کو کھول کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔

سوچیے! یہ کس قدر محرومی اور علمی بے توجہی ہوگی کہ ایک طالبِ علم پوری زندگی ان کتب کے حوالے سنتا رہے، ان سے استدلال کرتا رہے، مگر اپنی استعداد اور مواقع کے باوجود ایک بار بھی ان کے صفحات سے براہِ راست آشنائی حاصل نہ کرے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی خزانے کا تذکرہ تو بار بار سنے، مگر خود کبھی اس خزانے کے دروازے تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔ لہٰذا، ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر اس احساس کو بیدار کریں، اپنی علمی فکر کو جگائیں، اور کم از کم ایک بار ان عظیم کتب کا مطالعہ ضرور کریں۔

یہ مطالعہ نہ صرف ہمارے علم میں وسعت پیدا کرے گا، بلکہ ہمیں اسلاف کے علمی اسلوب، ان کے ذوقِ روایت، اوران کی عرق ریزی کا حقیقی شعور بھی عطا کرے گا۔ یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں محض ناقلِ حوالہ سے حقیقی طالبِ علم اور صاحبِ نظر محقق بنا سکتا ہے۔ یہ دعوت محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ شعور وآگہی کے ایک دلنشیں سفر کا نقطۂ آغاز ہے، ایسا سفر جو دل کو جِلا بخشتا ہے اور روح کو تازگی عطا کرتا ہے۔ متونِ احادیث کا مطالعہ درحقیقت اس چشمۂ صافی سے رشتہ جوڑنے کا نام ہے جس سے امتِ مسلمہ نے ہر دور میں علم کی روشنی، عمل کی پختگی اور کردار کی بلندی حاصل کی ہے۔

۞۞۞

درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد جب ایک طالبِ علم علمی زندگی کے ایک نئے مرحلے میں قدم رکھتا ہے تو اس کے سامنے امکانات کی ایک وسیع دنیا کھل جاتی ہے، یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں اس کی سابقہ محنتیں، ذوق اور رجحانات ایک واضح سمت اختیار کرنے لگتے ہیں۔ ہمارے علمی و دینی معاشرے میں اس مرحلے پر تخصصات کے انتخاب کا ایک خاص اور نمایاں رجحان دیکھنے میں آتا ہے، ایسا رجحان جو نہ صرف طلبہ کی علمی ترجیحات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ ہمارے تعلیمی مزاج کی بھی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔

عمومی طور پر دیکھا گیا ہے کہ اکثر طلبہ تخصص فی الفقہ کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ فقہ چونکہ عملی زندگی سے براہِ راست تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس کی کشش فطری بھی ہے اور معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ بھی، چنانچہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد اپنے علمی سفر کو اسی میدان میں آگے بڑھانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس انتخاب کے نتیجے میں ان کی توجہ فقہی جزئیات، فروعات، اختلافاتِ ائمہ، اور دلائل کی باریکیوں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی فکری دنیا انہی مباحث کے گرد گھومنے لگتی ہے، یہاں تک کہ وہ ان میں ایک خاص مہارت اور بصیرت حاصل کر لیتے ہیں۔

تاہم اس میلان کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس کے باعث متونِ احادیث اور علومِ حدیث سے براہِ راست اور عملی تعلق کسی حد تک پسِ منظر میں چلا جاتا ہے۔ اگرچہ فقہ کی بنیاد ہی حدیث پر ہے، لیکن عملی طور پر طلبہ کا ذوق فقہی استنباط اور مباحث میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ حدیث کے اصل متن سے براہِ راست اُنس اور اس کے روحانی و ذوقی اثرات سے استفادہ نسبتاً کم ہو جاتا ہے۔ یوں ایک ایسا خلا پیدا ہونے لگتا ہے جو بظاہر محسوس نہیں ہوتا، مگر علمی توازن کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

دوسری جانب وہ خوش نصیب طلبہ بھی ہیں جو تخصص فی علوم الحدیث کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ راستہ بلاشبہ نہایت دقیق، محنت طلب اور باریک بینی کا متقاضی ہے، ایسے طلبہ اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو فنونِ حدیث کی گہرائیوں

میں کھپا دیتے ہیں۔ اصولِ حدیث کی دقیق اصطلاحات، اسماء الرجال کی پیچیدہ تفصیلات، جرح وتعدیل کے نازک معیارات، اور تخریجِ احادیث کے تحقیقی مراحل۔۔۔ یہ سب ان کے شب وروز کا محور بن جاتے ہیں۔

وہ اس علم کی باریکیوں میں اس درجہ اُترتے ہیں کہ ایک ایک راوی کی سیرت، ایک ایک سند کی حیثیت، اور ایک ایک روایت کے مقام کا تعین ان کے لیے ایک علمی ذوق کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی ایک لطیف نکتہ قابلِ غور ہے: جب تمام تر توجہ فنونِ حدیث کے تحقیقی اور فنی پہلوؤں پر مرکوز ہو جاتی ہے تو بعض اوقات متونِ احادیث کے ذوقی، روحانی اور اصلاحی پہلو سے براہِ راست تعلق قدرے محدود ہو جاتا ہے۔

یعنی حدیث، جو دراصل ہدایت، تزکیہ اور قلبی کیفیت کا سرچشمہ ہے، وہ زیادہ تر ایک "موضوعِ تحقیق" بن کر رہ جاتی ہے، بجائے اس کے کہ وہ دل کی دنیا کو منور کرنے والی روشنی کے طور پر محسوس کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ علمِ دین کے یہ دونوں بڑے شعبے فقہ اور حدیث ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فقہ بغیر حدیث کے اپنی اصل کھو دیتی ہے، اور حدیث بغیر فقہ کے عملی تعبیر سے محروم رہ جاتی ہے۔

اسی طرح فنونِ حدیث کی تحقیق اپنی جگہ نہایت اہم ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ متونِ احادیث سے قلبی وابستگی، ان کے معانی میں تدبر، اور ان کی روحانی تاثیر کو محسوس کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

اس لیے گزارش ہے کہ ایک مثالی طالبِ علم وہ ہے جو ان دونوں جہات کے درمیان توازن قائم کر سکے؛ جو فقہ میں مہارت حاصل کرتے ہوئے حدیث کے اصل متن سے اپنا تعلق مضبوط رکھے، اور جو علومِ حدیث کی باریکیوں میں اترتے ہوئے بھی حدیث کے پیغام کو اپنے دل وروح میں جذب کرنے کا اہتمام کرے۔ ایسا طالبِ علم نہ صرف ایک ماہر محقق بنتا ہے بلکہ ایک باعمل، صاحبِ ذوق اور صاحبِ بصیرت عالم بھی بن کر ابھرتا ہے۔

آج کے دور میں اس توازن کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ علمی تخصص اپنی جگہ اہم ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ جامعیت، ذوق اور روحانیت کا امتزاج ہی اس علم کو حقیقی معنوں میں زندہ اور مؤثر بناتا ہے۔ اگر ہمارے تعلیمی ادارے اور طلبہ اس پہلو کی طرف متوجہ ہو جائیں تو یقیناً ایک ایسا علمی ماحول تشکیل پا سکتا ہے جہاں تحقیق کی گہرائی اور دل کی روشنی، دونوں ساتھ ساتھ پروان چڑھیں۔

۞۞۞

اہلِ عرب کا کتبِ احادیث کے ساتھ تعلق محض ایک علمی ضرورت نہیں بلکہ ایک زندہ روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں کے علماء کرام اور طلبائے دین ان متونِ مبارکہ کو اپنی علمی زندگی کا لازمی جزو سمجھتے ہیں۔ یہ کتب صرف نصاب کا حصہ نہیں بلکہ ان کے روزمرہ مطالعہ، فکر اور تدبر کا مرکز ہوتی ہیں، جن سے وہ نہ صرف دینی بصیرت حاصل کرتے ہیں

بلکہ اپنے طرزِ حیات کو بھی منور کرتے ہیں۔ دیارِعرب کے علمی حلقوں میں متون احادیث کی کتب کی تدریس نہایت منظم اور اعلیٰ معیار کے ساتھ انجام پاتی ہے، کئی مقامات پر ان کے لیے باقاعدہ دُروس کا اہتمام کیا جاتا ہے، جہاں اساتذہ اپنی گہری تحقیق اور فہم کے ساتھ طلبہ کی رہنمائی کرتے ہیں، یہ علمی مجالس محض معلومات کی ترسیل نہیں ہوتیں بلکہ فکر و تحقیق کے در وا کرتی ہیں، جہاں روایت اور درایت کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔

اہلِ عرب کے نظامِ تعلیم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں متونِ حدیث کے منتخب حصوں کو حفظ کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ محض یادداشت کی مشق نہیں بلکہ ایک شعوری اور بامقصد تربیتی عمل ہوتا ہے، جس کے ذریعے طلبہ کے دلوں میں احادیثِ مبارکہ کی محبت اور عظمت راسخ کی جاتی ہے۔ جب بچے کم عمری ہی میں ان مقدس کلمات کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتے ہیں تو ان کا قلبی میلان فطری طور پر سنتِ نبویہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ یہ الفاظ صرف زبان تک محدود نہیں رہتے بلکہ آہستہ آہستہ ان کی فکر، کردار اور طرزِ زندگی میں سرایت کر جاتے ہیں۔

حفظ متون کی وجہ سے ان کی متون احادیث کی کتب سے مناسبت قوی تر ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے فارغ التحصیل عالم دین کو متون احادیث سے اس قدر مناسبت نہیں ہوتی جس قدر وہاں کے طلباء کرام کو مناسبت تامہ حاصل ہوتی ہے، یوں یہ طریقِ تعلیم نہ صرف علمی بنیاد فراہم کرتا ہے بلکہ ایک روحانی وابستگی بھی پیدا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں نئی نسل احادیثِ نبویہ کے نور سے منور ہو کر پروان چڑھتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اہلِ عرب نے احادیثِ نبویہ کے ساتھ اپنے تعلق کو ایک زندہ امانت کے طور پر سنبھال رکھا ہے، جس کی روشنی میں ان کی علمی اور روحانی زندگی پروان چڑھتی ہے۔ آیئے ......! اب ہم بھی اس سمت رخ کریں، جہاں علم محض معلومات نہیں رہتا بلکہ نور بن کر دلوں میں اترتا ہے؛ جہاں متون احادیث کے مطالعہ کو تعلیمی نظام کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ آیئے ۔۔۔۔! وہی طریق اختیار کریں جو متون احادیث میں ہماری استعدادوں کو جلا بخشے، اور جو" لا ادری" سے" الحمدللہ ادری" کی سطح تک لے آئے۔

۞۞۞

متونِ احادیثِ نبویہ کے عظیم الشان ذخیرے سے تعلق اور اس کے ساتھ مناسبت قائم کرنا ہر طالبِ علمِ دین کے لیے نہایت ناگزیر اور بنیادی تقاضا ہے۔ یہ محض ایک علمی مشغلہ یا اختیاری ذوق نہیں، بلکہ دینی فہم کی اساس اور شریعت کے صحیح ادراک کی کنجی ہے۔ جس طرح قرآنِ کریم کی تفہیم کے لیے اس کے اسبابِ نزول، لغت اور تفسیر سے واقفیت ضروری ہے، اسی طرح سنتِ نبویہ کے فہم کے لیے کتبِ حدیث کے مناہج، ترتیب اور اسالیب سے آگاہی ایک لازمی امر ہے۔ کم از کم درجۂ مناسبت یہ ہونا چاہیے کہ طالبِ علم اس بات کو سمجھ سکے کہ محدثین نے احادیث کو

کس اصول کے تحت جمع کیا، کن معیارات کو پیشِ نظر رکھا، اور مختلف کتب میں ترتیب وتبویب کا کیا پس منظر ہے؟۔

یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ بعض محدثین نے فقہی ابواب کے مطابق احادیث کو مرتب کیا، تاکہ مسائلِ شرعیہ کے استنباط میں سہولت ہو، جبکہ بعض نے مسانید کے طرز کو اختیار کیا، جس میں ہر صحابی کی مرویات کو یکجا کر کے سند کی اصل کو محفوظ رکھا گیا۔ اسی طرح بعض کتب میں صحت کا خاص اہتمام ملتا ہے، اور بعض میں وسعتِ روایت کو ترجیح دی گئی ہے۔ جیسے انہی عظیم ذخائر میں سے ایک جلیل القدر اور بلند پایہ مجموعہ ''مسند امام احمد بن حنبل'' ہے، جو اپنے منہج، وسعت اور علمی مقام کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

لہٰذا طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ اس کو معلوم ہو کہ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند کو کس ترتیب پر تالیف کیا۔۔؟، وہ کس ترتیب سے روایات کو لاتے ہیں۔۔؟، ان کا منہج کیا ہے۔۔؟ اس کتاب کے محقق شیخ احمد شاکر کی تحقیق کا منہج کیا ہے۔۔؟ شیخ احمد شاکر کی تحقیق پر شیخ حبیب الرحمن اعظمی نے کیا استدراکات پیش کیے ہیں۔۔۔؟ شیخ احمد شاکر نے کس وسعت ظرفی سے ان کو قبول کیا ہے۔۔؟ اور ان کے لیے کیا کلمات تشکر لکھے ہیں۔۔؟ دوسرے محقق شیخ شعیب ارناؤوط کا کیا طریقہ تحقیق ہے۔۔؟ کیسے محققین کی جماعت کے ساتھ ملکر ہر ہر حدیث کی تحقیق کی ہے۔۔؟ شیخ احمد بن عبدالرحمن البنا الساعاتی نے کیسے اس مجموعہ ''مسند'' کو فقہی ابواب ترتیب پر ڈھالا ہے۔؟، اور اس پر بطور حاشیہ کیسی شرح پیش کی ہے۔۔۔؟ انہی متون احادیث میں ایک شاندار کتاب ''المصنف لابن ابی شیبہ'' ہے، امام ابن ابی شیبہ کا منہج کیا ہے۔۔۔؟ وہ احادیث مبارکہ کو کس انداز سے لے آئے ہیں۔۔۔؟، اس کتاب کے محقق شیخ محمد عوامہ کا منہج تحقیق کیا ہے۔۔۔؟ کن نسخوں کو انہوں نے زیر نظر رکھا ہے،۔۔؟ اسی طرح ''المصنف للامام عبدالرزاق'' میں امام محدث کا کیا منہج ہے۔۔۔۔؟، وہ آثار کو کس ترتیب سے لاتے ہیں۔۔۔؟، اس کتاب کے محقق شیخ اعظمی کا کیا منہج ہے۔۔۔؟۔

الحاصل متون احادیث کی کتب کا مطالعہ ضروری ہے، نہیں تو ساری زندگی ان کتب کے حوالے بے یقینی اور لاعلمی کی بنا پر دیتے رہیں گے اور دل یقین کی کیفیت سے خالی ہوگا۔

ایمان پر استقامت وقت کا ایک اہم تقاضا

مولانا مرشد قاسمی

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ (۳۰) (حم السجدہ)

ترجمہ: (دوسری طرف) جن لوگوں نے کہا کہ: "ہمارا رب اللہ ہے" اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، تو ان پر بے شک فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اتریں گے کہ: "نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو، اور اس جنت سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

ایمان ایک عظیم قیمتی سرمایہ ہے، ہم نے رب کی ربوبیت کا اقرار کیا، اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق، معبود، مربی اور محافظ مانا، یقینا یہ ہماری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، اسی بنیاد پر جنت کی ابدی راحت، اس کی انوکھی، نرالی، لذیذ ترین نعمتیں اور ربِ کائنات کا دیدار نصیب ہوگا۔ ہم نے بہت ہی آسان کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دل کی گہرائیوں کے ساتھ زبان سے کہہ کر اپنا ایمان اور عقیدہ بنالیا کہ وہی ایک اکیلا معبود، لائقِ پرستش اور قابلِ سجود ہے اور پھر اس کے نازل کردہ تمام احکام، کتابیں اور پیغمبر برحق ہیں۔

الغرض! کلمہ طیبہ اور ایمان کے آسان ہونے کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ایک شخص کو جہنم کا سب سے ہلکا عذاب ہو رہا ہوگا، ممکن ہے کہ وہ مومن نہ ہونے کے باوجود ایمان اور اہلِ ایمان سے محبت اور ان کی نصرت کرتا ہوگا، چوں کہ اللہ تعالیٰ کو دین اور ایمان پسند ہے، تو اس سے محبت اور اس کی نصرت بھی پسند ہے، اس شخص کے تلوے کے نیچے ایک چنگاری رکھ دی جائے گی جس سے اس کا دماغ ہانڈی کی طرح کھولے گا، وہ تمنا کرے گا کہ کاش! آج میرے پاس دنیا کی دولت ہوتی؛ تو میں اس کو دے کر اپنی جان اِس عذاب سے چھڑا لیتا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے بندے! آج تو پوری دنیا کی دولت دینے کو تیار ہے؟ میں نے تو دنیا میں تمہارے سامنے بڑی آسان چیز پیش کی تھی یعنی کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا اقرار کر کے اس عذاب سے بچ جاتا۔

ایمان سراسر فضلِ الٰہی ہے:

لیکن ایمان وہدایت کے سلسلے میں ہمیشہ یہ بات ہمارے پیشِ نظر رہے کہ یہ ساری توفیق محض اُس ذات کے فضل

اورعنایتوں سے ہے،اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ایمان والوں کی شان بیان کی:

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔

متقی وہ حضرات ہیں جوغیب پرایمان رکھتے ہیں،نماز قائم کرتے ہیں،اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں۔اوروہ حضرات جوان تمام باتوں پرایمان رکھتے ہیں جوآپ کی طرف اورآپ سے پہلے پیغمبروں کی طرف نازل کی گئیں،اورآخرت پریقین رکھتے ہیں۔

ایمان والوں کے اِن تمام اوصاف کو بیان کرنے کے بعداللہ تعالیٰ نے ہم سب کی آنکھیں کھول دی ہیں،فرمایا: **اولئک علی ھدی من ربھم** ﴾ یہ سارے لوگ اپنے رب کی جانب سے ہدایت پر ہیں۔اگررب کی عنایت اوراس کافضل نہ ہوتاتو ہم ہرگز ایمان وہدایت والے نہ ہوتے۔

ہم سوچیں جس دن ہم پیدا ہوئے اُس دن ہزاروں جانور بھی پیدا ہوئے تھے،اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم کوجانوروں میں پیدا کردیتا،لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسانہیں کیا۔مزید سوچیں اس دن ہزاروں انسان بھی پیدا ہوئے ہوں گے اوروہ نہ جانے کس کس باطل مذہب اور کیسے کیسے من گھڑت عقیدوں کی طرف گئے،لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم سب کوصحیح مذہب اورصحیح عقیدے کے لیے چنا،ہم اپنے ایمان کی قدرکرتے ہوئے اس عظیم سرمائے کی حفاظت میں ہرقسم کی کوتاہی سے گریز کریں۔

ایمان کی حفاظت کی ضرورت کیوں؟

یہ قیمتی سرمایہ ہم کوبغیر استحقاق اورکسی طلب وسوال کے مل گیا،کہیں ایسا نہ ہو(نعوذ باللہ) کہ ایمان کا کوئی لٹیرا،کوئی دشمنِ اسلام ہمارے ایمان کوبگاڑ دے،اس کولوٹ لے جائے،آج کے دورمیں اس کی حفاظت کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔حضرات صحابہ کرامؓ اپنے ایمان کے بارے میں ہمیشہ خائف رہتے،جب کہ وہ زمانہ خیرالقرون کا تھا۔اُس زمانے میں اتنے فتنے اوراتنے گناہ کے آلات توکیا؛خیالات بھی نہیں تھے،آج توہرطرف باطل کا دوردورہ ہے،ہرطرف بے دینی کابازارگرم ہے،قدم قدم پر فتنے ہی فتنے ہیں،نت نئی شکلوں میں فتنے اور باطل عقیدے سامنے آرہے ہیں،گناہ کے آلات لاتعد ولاتحصٰی (بے شمار) ہیں،دشمنانِ اسلام نے گناہ کے اِن آلات؛بل کہ جراثیم کوآج ہرگھر میں ہی نہیں ہرہاتھ میں پہنچادیا ہے،ایسے سنگین اور پرخطر ماحول میں آج ہم کواپنے ایمان کی حفاظت کی فکر،اورایمان پراستقامت کی دعا قرونِ اولیٰ سے زیادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ایمان پراستقامت:.....آج وقت کی اہم پکار.....ایمان والوں کوایمان پرجمنے کی دعوت ہے۔

تمام دشمنانِ اسلام کی تحریکوں، تنظیموں، اسکول، کالجز کے نظام اور نصاب کی پوری؛ بل کہ جان توڑ کوشش یہی ہے کہ ایمان والوں کا ایمان متزلزل ہوجائے، وہ اپنے ایمان سے ڈگمگا جائیں، کسی بھی طرح ایمان وایقان کی گاڑی پٹری سے اتر جائے۔ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے فقط ایمان ہی کا تذکرہ نہیں کیا؛ بل کہ اس کے ساتھ استقامت اور اس ایمان پر جمنے کا بھی تذکرہ کیا، فرمایا **قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا** جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اس پر جم گئے۔

ایک مرتبہ ایک صحابی سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: **"قل لی فی الاسلام قولا لا اسال عنہ احدا غیرک فقال قل آمنت باللہ ثم استقم"** (الجمع بین الصحیحین)

مجھ سے آپ اسلام کے بارے میں ایسی جامع بات ارشاد فرمادیں کہ آپ کے بعد کسی اور سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ پڑے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہہ میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر جم جا۔

استقامت چھوڑنے پر عذابِ جہنم کا اندیشہ:

استقامت کے چھوڑنے پر عذابِ جہنم کا قوی اندیشہ ہے۔ حضرت سری سقطی ایک درخت کے نیچے آرام فرمارہے تھے، تو درخت سے آواز آئی: "یا سری کن مثلی" اے سری میری طرح ہوجایئے، آپ نے پوچھا تیری طرح ہونے کا کیا مطلب ہے؟ درخت نے کہا: "الناس یرمونی بالاحجار وانا ارمیہم بالاثمار" لوگ میرے اوپر پتھر پھینکتے ہیں اور میں ان کو پھل دیتا ہوں۔ پھر آپ نے پوچھا لیکن یہ بتاؤ، فکیف مصیرک اِلی النار" تیرا ٹھکانہ آگ کیوں ہوتا ہے؟ بالآخر لوگ تجھے کاٹ کر کیوں جلادیتے ہیں، تو درخت نے کہا دراصل میں استقامت سے محروم ہوں، ہوا جب چلتی ہے تو کبھی دائیں کبھی بائیں جھک جاتا ہوں، اس لیے مجھے آگ میں جھونک دیا جاتا ہے، خدا نہ کرے کہ ہم بھی اُس درخت کی طرح ہوجائیں کہ جدھر کو ہوا چلے، بس ادھر کو جھک جائیں اور دین وشریعت کے ماحول کو اپنی خواہشات کے تابع کردیں۔

مسجد ومدرسہ کے ماحول میں، اللہ کے راستے میں نکلنے کے دوران تو ہم مسلمان رہیں، ایمان وشریعت پر جمے رہیں، اور اس ماحول کے ختم ہوتے ہی ہم سب کو خیرآباد کہدیں، بازار میں ہوں تو بازاری ہوجائیں، آفسوں اور کاروبار میں اسلام اور احکامِ اسلام سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ ہمارا یہ رویہ ایمان اور تقاضۂ ایمان کے بالکل خلاف ہوگا۔

استقامت کی حقیقت واہمیت:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ڈاڑھی کے بالوں کی سفیدی دیکھ کر ایک صحابی نے تعجب کیا اور کہا اے اللہ کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر جلد بڑھاپا آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شیبتنی ہود" مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے سورۂ ہود کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو استقامت کا حکم دیا گیا ہے **فاستقم کما امرت** کہ آپ ایسا استقامت اختیار کریں جیسا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین اور اعمال کے سلسلے میں ہمیشہ استقامت اختیار کرتے، لیکن فکر اور غم یہ رہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے منشا اور مرضی کے مطابق استقامت ہوئی یا نہیں؟

حضرت عمر فاروقؓ نے استقامت کی بڑی اچھی تشریح فرمائی:

"**ان تستقیم علی الأمر و النهی و لا تروغ منه روغان الثعالب**" استقامت یہ ہے کہ تو سارے اوامر اور نواہی پر اپنے آپ کو جمادے، اور اس سے بچنے کے لیے لومڑی کی طرح راہِ فرار اختیار نہ کر۔ یعنی استقامت یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سارے حکموں کو پورا کریں، ساری منع کی ہوئی چیزوں سے بچیں، اوامر و نواہی کے لیے کوئی حیلہ و تدبیر نہ کریں، حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنے کی کوئی تدبیر نہ تلاش کریں کہ کس طرح ہم سے یہ حکم معاف ہو جائے۔

استقامت کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ نے آیتِ کریمہ میں استقامت اختیار کرنے والوں کو بشارت سنائی کہ فرشتے ان پر اترتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کوئی اندیشہ نہ کرو، کچھ غم نہ کرو، اور جنت کی خوش خبری سن لو۔ روایتوں میں آتا ہے کہ فرشتوں کی جانب سے یہ بشارت تین موقع پر سنائی جاتی ہے۔ موت کے وقت، قبر میں، اور حشر میں۔ سب سے پہلے یہ بشارت موت کے وقت سنائی جاتی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے دنیا سے مسکراتے ہوئے جاتے ہیں اور موت کے وقت ان کے چہرے پر تبسم ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

میں تم کو کامل مومن کی ایک پہچان بتلاتا ہوں، جب ان کو موت آتی ہے، تو مسکراہٹ ان کے ہونٹ پر ہوتی ہے، اس طرح ملائکہ مزید بشارت سناتے ہوئے کہتے ہیں، جس طرح ہم دنیا میں رفیق تھے اور تم کو خیر کے کاموں پر آمادہ کرتے رہتے تھے، اسی طرح آخرت میں بھی ہم تمہارے رفیق ہیں۔ اور آج تمہارے لیے وہ تمام نعمتیں ہیں، جن کی تمہیں خواہش ہو اور جو تم طلب کرو۔ آج خصوصی مہمان نوازی ہے، بڑے معاف کرنے والے بڑے مہربان رب کی طرف سے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان تمام بشارتوں کا مستحق بنائے، ہم سب کا ایمان پر خاتمہ فرمائے اور اس پرفتن دور میں ایمان اور اعمالِ صالحہ پر استقامت نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

چراغِ علم، پیکرِ حلم

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس شہید رحمہ اللہ

مولانا مفتی سراج الحسن

دنیا میں کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو محض فرد نہیں رہتیں بلکہ ایک عہد، ایک فکر اور ایک روایت کی نمائندگی بن جاتی ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس ترنگزئی شہید (رحمہ اللہ) بھی انہی بلند پایہ ہستیوں میں سے تھے جن کی زندگی علم، حلم، تدریس اور خدمتِ دین سے عبارت تھی۔

تدریس کا انوکھا اسلوب:

کردار کی تربیت انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز تدریس سے کیا اور جلد ہی اپنے اسلوبِ تدریس، علمی گہرائی اور اخلاقی بلندی کی وجہ سے نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ حدیثِ نبوی کی تدریس ان کا خاص میدان تھا، جہاں انہوں نے ہزاروں طلبہ کو علم کے زیور سے آراستہ کیا۔ ان کے درس میں صرف الفاظ کی تشریح نہیں ہوتی تھی بلکہ فکر کی تعمیر اور کردار کی تربیت بھی ہوتی تھی۔ ان کے شاگرد نہ صرف عالم بنتے تھے بلکہ ایک ذمہ دار انسان بن کر معاشرے میں اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو اعتدال اور توازن تھا۔ وہ شدت پسندی اور تعصب سے کوسوں دور تھے۔ مولانا کی شخصیت میں سنجیدگی، وقار اور فکری پختگی نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔ اختلافِ رائے کو وہ علمی انداز میں برداشت کرتے اور ہمیشہ مکالمے اور حکمت کا راستہ اختیار کرتے۔ ان کی گفتگو میں نرمی، دل نشینی اور اثر آفرینی تھی جو سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر طبقے میں یکساں طور پر مقبول تھے۔

صبر و تحمل کا عملی درس:

ان کی زندگی کا ایک اور اہم پہلو ان کی خاموشی اور تحمل تھا۔ حالیہ دنوں میں جب بعض حلقوں کی جانب سے تنقید اور نامناسب رویوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر انہوں نے جواب میں صبر اور وقار کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان کا یہ طرزِ عمل دراصل ایک عملی درس تھا کہ اہلِ علم کا ہتھیار دلیل، صبر اور اخلاق ہوتا ہے، نہ کہ اشتعال اور ردِ عمل۔ وہ صرف ایک استاد نہیں تھے بلکہ ایک مربی، مصلح اور داعی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی علم کی اشاعت، دین کی خدمت اور انسانوں کی اصلاح میں گزار دی۔ ان کا اندازِ دعوت نرم، مؤثر اور دلنشین تھا۔ وہ دلوں کو جوڑنے والے انسان تھے، نہ کہ توڑنے والے۔

ان کی یاد ایک روشنی:

ان کی شہادت نہ صرف ایک فرد کا نقصان ہے بلکہ ایک پورے علمی وفکری سلسلے میں ایک خلا ہے جسے پر ہونے میں ایک زمانہ لگے گا۔آج ان کی جدائی ایک ایسا خلا چھوڑ گئی ہے جو مدتوں محسوس کیا جائے گا۔ان کے شاگرد، ان کے چاہنے والے اور پورا علمی حلقہ ان کی کمی کو شدت سے محسوس کرے گا۔آج جب وہ ہم میں نہیں رہے تو ان کی یاد ایک روشنی کی طرح ہمارے درمیان موجود ہے۔ان کی باتیں، ان کا انداز، ان کا حلم یہ سب ہمارے لیے رہنمائی کا سامان ہیں۔

فکری وراثت کا نچوڑ:

ان کی زندگی ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ علم اگر اخلاق سے خالی ہو تو بے اثر ہو جاتا ہے، اور اختلاف اگر برداشت کے بغیر ہو تو تباہی کا سبب بنتا ہے۔ان کی جدائی ایک خلا ضرور ہے، مگر ان کا نقش ایسا گہرا ہے جو مٹ نہیں سکتا۔وہ اپنے پیچھے شاگردوں کی ایک ایسی جماعت چھوڑ گئے ہیں جو ان کے مشن کو آگے بڑھائے گی، اور ان کے اسلوبِ اعتدال وحکمت کو زندہ رکھے گی۔

قائدین وفاق المدارس کا اظہار تعزیت:

شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس شہیدؒ کی رحلت پر جہاں علمی و دینی حلقے سوگوار ہیں، وہیں ملک بھر کی دینی قیادت نے بھی اس عظیم سانحے کو ملتِ اسلامیہ کا بڑا نقصان قرار دیا ہے۔وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے قائدین نے اپنے تعزیتی پیغامات میں اس اندوہناک واقعے پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اسے نہایت افسوسناک اور قابلِ مذمت قرار دیا۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، سینئر نائب صدر مولانا انوار الحق صاحب، ناظمِ اعلیٰ مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب اور دیگر اکابرین نے اپنے مشترکہ تعزیتی بیان میں کہا کہ شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس شہیدؒ ایک بے ضرر، باوقار اور جید عالمِ دین تھے جنہوں نے پوری زندگی درسِ حدیث، تعلیمِ دین اور اصلاحِ امت میں بسر کی۔ان کے ہزاروں شاگرد آج دنیا کے مختلف خطوں میں دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں، جو ان کے اخلاص، علمی عظمت اور تربیتی اثرات کا زندہ ثبوت ہیں۔

ناظم اعلیٰ وفاق حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا:

''شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس شہید رحمہ اللہ علوم نبوت کے امین، اہل حق کے ترجمان اور لاکھوں طلباء وعلماء کے علمی روحانی مربی تھے۔ان کے دروس حدیث سے برصغیر سمیت دنیا بھر کے بے شمار افراد مستفید ہوئے۔

قائدینِ وفاق نے اس افسوسناک حملے کے مجرموں کی فوری گرفتاری اور انہیں قرار واقعی سزا دینے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ علماء کرام ملت کا علمی سرمایہ ہیں، ان کا تحفظ ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے۔انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ممتاز علماء اور دینی شخصیات کے لیے مؤثر اور فول پروف سیکیورٹی کے انتظامات یقینی بنائے جائیں تاکہ ایسے المناک واقعات کی روک تھام ہو سکے۔''

اسی طرح وفاق المدارس العربیہ خیبر پختونخوا کے ناظم مولانا حسین احمد نے ضلع چارسدہ ترنگزئی میں منعقدہ تعزیتی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس شہیدؒ کی دینی، علمی اور تدریسی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا۔انہوں نے کہا کہ:

''حضرت شیخ شہیدؒ محض ایک فرد نہیں بلکہ ایک مکمل علمی ادارہ، ایک فکر اور ایک زندہ درسگاہ تھے، جنہوں نے اپنی پوری زندگی علومِ نبوت کی اشاعت اور ہزاروں طلبہ کی فکری وروحانی تربیت میں صرف کردی۔انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ شیخ شہیدؒ کی جدائی سے پیدا ہونے والا خلا مدتوں محسوس کیا جاتا رہے گا، تاہم ان کے تلامذہ، متعلقین اور اہلِ مدارس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان کے علمی ودینی مشن کو آگے بڑھائیں اور اعتدال، اتحاد اور خدمتِ دین کے اس راستے کو جاری رکھیں جس کے لیے شیخ شہیدؒ نے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی تھی۔''

بلاشبہ شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس شہیدؒ کا وجود ایک روشن چراغ تھا، جو بجھ کر بھی اپنے پیچھے علم، حکمت، صبر اور اعتدال کی ایسی روشنی چھوڑ گیا ہے جو مدتوں اہلِ علم کے دلوں اور درسگاہوں کو منور کرتی رہے گی۔اللہ تعالیٰ اس مردِ درویش، اس معلمِ باوقار اور اس داعیِ مخلص کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔ چراغِ علم بجھا، مگر روشنی باقی ہے۔۔۔رہے نام اللہ کا!

چراغِ علم بجھا مگر ضیا باقی ہے
دلوں میں آج بھی اُس کی صدا باقی ہے
وہ اپنے علم کے جوہر لٹا کے رخصت ہوا
ہمارے ذہن میں اب تک ضیا باقی ہے
وہ اک چراغ تھا تہذیبِ دیں کی راہوں کا
بجھا ہے آج مگر راستہ باقی ہے

اکابر کے منظورِ نظر، سیّد سلمان گیلانیؒ

مولانا حنیف خالد

استاذ دارالعلوم کراچی

۳؍رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ مطابق ۲۱ فروری ۲۰۲۶ء ہفتہ کے روز تراویح سے فارغ ہوکر گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ شاعرِ اسلام وشاعرِ ختم نبوت جناب سید سلمان گیلانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ طویل علالت کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے ہیں، **انا للہ وانا الیہ راجعون، ان للہ ما أخذ ولہ ما أعطیٰ وکل شئی عندہ باجل مسمی فلنصبر ولنحتسب**

سید سلمان گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی قدر جناب سید امین گیلانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے پائے کے نامور قومی شاعر تھے، تمام دینی وادبی ہم عصر جماعتوں اور اداروں میں آپ کا یکساں احترام کیا جاتا تھا۔ بچپن میں بڑے بڑے جلسوں میں اُن کا منظوم کلام اُن کی مترنم آواز میں سننے کا موقع ملا، اشعار کی معنویت، پڑھنے کا خوبصورت اور پرسوز انداز ایسا تھا کہ آج تک اس کا اثر ذہن پر نقش ہے، پورا مجمع ان کی گرفت میں ہوتا تھا، سید امین گیلانی صاحبؒ نے بڑے بڑے علماء کرام کی موجودگی میں ایسی نظمیں اور نعتیں پڑھیں جن میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے اوصاف حمیدہ نیز ظالم وجابر حکمرانوں کے خلاف کلمہ حق ایسے جوش وجذبے کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا جس سے سامعین بے حد متاثر ہوتے تھے، آپؒ کی ایک نعت بہت مشہور ہوئی تھی جس کا مطلع یہ تھا:

حضور آئے تو کیا کیا ساتھ نعمت لے کے آئے ہیں
اخوت، علم وحکمت، آدمیت لے کے آئے ہیں

سید امین گیلانی رحمۃ اللہ علیہ امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قدس سرہ کے رفقاء میں سے تھے، ان کی ولولہ انگیز شاعری نے ختم نبوت، تحریک نظامِ مصطفیٰ اور ملی تاریخ کی متعدد تحریکات میں ہمت وحوصلے کی روح پھونکنے میں اہم کردار ادا کیا۔

سید امین گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر صاحبزادے محترم جناب سید سلمان گیلانی صاحبؒ بھی طرز، ادا اور لب ولہجہ میں اپنے والد صاحبؒ کا عکس تھے، شکل وشباہت میں بھی بالکل انہی کی طرح تھے، اشعار پڑھنے کا انداز بھی بعینہ وہی تھا البتہ والد صاحبؒ کا انداز بڑا ہی بارعب ہوتا تھا، نعت میں تو سلمان گیلانی صاحبؒ کا انداز بھی وہی تھا مگر

دیگر مشاعروں میں اُن کا انداز مزاحیہ ہوتا تھا مگر اس میں بھی گیلانی صاحبؒ اپنا موقف ونظریہ بہت ہی حسین پیرائے میں سامعین کے سامنے پیش کررہے ہوتے تھے، سطحی انداز سے دیکھنے والا بعض اوقات شروع شروع میں اس اسلوب کو مناسب خیال نہیں کرتا تھا مگر پوری طرح غور وفکر کے بعد اندازہ ہوتا تھا کہ ماشاءاللہ گیلانی صاحبؒ بہت ہی لطیف پیرائے میں نسل نو کی عمدہ تربیت کررہے ہیں۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ معاشرے میں پھیلے ہوئے بگاڑ اور فتنوں کو دور کرنے کے لئے صرف خشک نصیحت کافی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی طنز ومزاح کے نشتر بھی ضروری ہوتے ہیں، مزاح سے بھرپور ان کے اشعار محض ہنسنے ہنسانے کے لئے نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کے ضمن میں معاشرتی برائیوں پر وہ ایسی کاری ضرب لگاتے تھے کہ سننے والا ہنسنے کے ساتھ ساتھ اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔

سید سلمان گیلانیؒ نے اپنے والد مرحوم کی عظیم وراثت کو نہ صرف سنبھالا بلکہ اپنے منفرد انداز اور دل نشین لہجے کے ساتھ اُسے آگے بڑھایا۔ ان کی شاعری میں عقیدت کی چاشنی، محبت رسول کی وارفتگی اور سلامت فکر نمایاں تھی، سید سلمان گیلانیؒ کا سفر مدحِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوکر دِفاعِ ختم نبوت پر مکمل ہوا۔ مرحوم کی مقبولیت کا دائرہ صرف پاکستان تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ بیرون ملک بھی بے حد مقبول تھے، وہ صرف ایک روایتی شاعر نہیں تھے بلکہ ناموسِ رسالت کے ایک نڈر، بے باک اور جری سپاہی تھے۔

سید سلمان گیلانی مرحوم کا زندگی بھر علمائے کرام اور اہلِ دین سے خوب ادب ومحبت اور نیاز کا تعلق رہا، وہ اپنے تمام اکابر سے وارفتگی کی حد سے محبت کرنے والے اور سب کے منظورِ نظر تھے۔ ''قدرِ زر زرگر بداند یا بداند جوہری'' کے مصداق استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم بھی ان سے بہت شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے، ان کے کلام کی خوب پذیرائی کے ساتھ حوصلہ افزائی بھی فرماتے، حضرت والا مدظلہم کے گھر پر منعقد ہونے والی کئی نشستوں میں حضرت والا مدظلہم ان کا کلام بڑے اشتیاق سے سنتے اور انہیں اپنا کلام بھی سناتے۔ انہوں نے حضرت مدظلہم کے لیے یہ شعر بھی کہا تھا کہ:

دنیائے علم میں ہے ترا راج اے تقی
تو اس جہاں کا ہے شہِ بےتاج اے تقی

۷ مارچ ۲۰۲۱ء کو جامعہ بنوریہ سائٹ کراچی میں ختم بخاری شریف کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم سے ملاقات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے گیلانی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

''جب مجھے معلوم ہوا کہ شیخ الاسلام اپنے میزبانوں اور چند دیگر خصوصی مہمانوں کے ہمراہ محوِ تناولِ طعام ہیں تو ان سے ملنے کی نیت سے میں بھی درآیا اور بے ساختہ کہا کہ:

کیوں نہ کروں شمولیت خیر کا کام دیکھ کر

ساقیا آ گیا ہوں میں بادہ و جام دیکھ کر

شیخ کے ہاتھ میں لقمہ تھا وہ اپنے حلق میں لے جانے والے ہی تھے کہ مجھ ناچیز پر نظر پڑ گئی اور فوراً مرحبا و حبذا کی صدا کے ساتھ مجھے عین اس وقت دونوں بازو پھیلا کر کُرسی پر بیٹھے بیٹھے گلے لگا یا اور وہ لقمہ میرے منہ میں ڈال دیا، ساتھ ہی برادرم نعمان نعیم کو حکم دیا کہ گیلانی صاحبؒ کو یہاں میرے ساتھ کرسی دو، یہاں بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ اللہ اکبر..... میں خود اس اعزاز و اکرام پر حیران تھا مگر یہ لمحے مجھے تا زیست نہیں بھولیں گے اس لئے کہ اس لقمہ کی لذت اور نورانیت آج تک میری روح کی سرشاری اور قلب کی بیداری کا سامان بنی ہوئی ہے۔ بہت سے اللہ والوں کے ساتھ ایک دستر خوان پر بیٹھ کر کھانے کے مواقع ملتے رہتے ہیں، کئی بار ان کے ہاتھ سے اپنے منہ میں نوالہ لینے کا شرف بھی حاصل ہوتا رہتا ہے مگر حالیہ دنوں میں اس سے زیادہ خوش قسمت لمحہ اور کوئی نہیں آیا۔''

30 نومبر 2022 میں استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے کراچی میں ''حرمتِ سود سیمینار'' منعقد کیا تھا جس میں ملک بھر کے علماء کرام اور رہنماؤں کے ساتھ تقریباً پوری مذہبی و سیاسی قیادت کو جمع کر دیا تھا اور اس میں سید سلمان گیلانی صاحبؒ کو بھی خاص طور پر مدعو فرمایا تھا۔ بندہ بھی الحمدللہ اس کے انتظامات میں شریک تھا، حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری صاحب مدظلہم نقابت کے فرائض انجام دے رہے تھے، جب گیلانی صاحبؒ تشریف لائے تو انہوں نے بندہ سے پوچھا کہ مجھے پڑھنے کا موقع کب ملے گا؟ بندہ نے حضرت قاری صاحب کو ان کی آمد کا بتایا تو حضرت قاری صاحب نے حاضرین سے فرمایا کہ اب ہم آپ کو نثر سے نظم کی طرف لیے چلتے ہیں اور جناب سید سلمان گیلانی صاحبؒ کے نام کا اعلان کیا اور پھر گیلانی صاحبؒ نے اپنے مخصوص انداز میں جب اپنا خصوصی نعتیہ کلام پیش کیا تو بلا استثناء تمام سامعین اس پر جھوم رہے تھے، گیلانی صاحبؒ نے مقطع میں اپنے خوبصورت جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

پاؤں دھو دھو کے پیوں ان کے میں گیلانی جو

سود سے قوم کی ہیں جان چُھڑانے والے

8 مارچ 2021ء کی بات ہے جب بندہ جامعہ دارالعلوم کراچی کی مسجد کے قریب درسگاہ میں موجود تھا، عشاء کے بعد کا وقت تھا، مسجد سے نعت پڑھنے کی پرکشش آواز آ رہی تھی، بندہ سے رہا نہ گیا اور فوراً مسجد میں پہنچ گیا، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ جناب سید سلمان گیلانی صاحبؒ بڑے ہی عشق و محبت کے ساتھ نعت سنا رہے ہیں،

استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب مدظلہم اور دیگر حضرات کرسیوں پر تشریف فرما ہیں، طلبہ کی بھی خاصی تعداد موجود ہے، بندہ بھی سامعین میں شامل ہوگیا، صحابہ کرام کی مدح میں اشعار پڑھتے ہوئے گیلانی صاحبؒ پر ایسا وجد طاری ہوتا تھا کہ وہ بے اختیار اپنی نشست سے کھڑے ہوجاتے تھے۔

اسی دوران گیلانی صاحب مرحوم نے اپنی ایک مشہور نعت یہ سنائی کہ:

جو اُن کے ہونٹوں پہ آگیا ہے، وہ لفظ قرآن ہوگیا ہے
جو لفظ قرآن ہوگیا ہے، وہ میرا ایمان ہوگیا ہے

اوراسی کے ذیل میں سفرمعراج سے متعلق جب یہ شعر پڑھا کہ:

یہ وقت کی نبض تھم گئی کیوں؟ خموش کیوں ہے نظامِ ہستی
مَلک ہیں ششدر، کہ عرش پر آج کون مہمان ہوگیا ہے

تو حضرت رئیس الجامعہ مدظلہم سمیت تمام سامعین نے خوب داد دی، اسی موقع پر سفرمعراج کی تشریح کے ضمن میں گیلانی صاحبؒ نے یہ واقعہ بھی سنایا کہ میں ایک دفعہ بچوں کو لاہور میں بحریہ ٹاؤن کی سیر کروا رہا تھا، وہاں کی مسجد سے باہر نکل رہا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی ''گیلانی صاحب''! میں متوجہ ہوا تو دیکھا کہ ایک شخص کی گود میں ایک بچہ ہے جس کی عمر ڈیڑھ سال لگ رہی تھی مگر اس شخص نے بتایا کہ اس بچے کی عمر ڈیڑھ سال نہیں بلکہ اٹھارہ سال ہے، اسی بچے نے آپ کو ''گیلانی صاحب'' کہہ کر آواز دی ہے، اس بچے کی عقل تو بڑھ رہی ہے مگر جسم نہیں بڑھ رہا، عمر اٹھارہ سال ہے مگر جسم اتنا چھوٹا ہے جتنا ڈیڑھ سال کے بچے کا ہوتا ہے، گیلانی صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ جب چاہے جس چیز کو چاہے روک دے، یہاں اللہ تعالیٰ کی مشیت سے عقل تو بڑھ رہی ہے مگر جسم نہیں بڑھ رہا، معراج کی رات اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کی حرکت روک دی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے ایک حصے میں ساتوں آسمانوں کی سیر کر کے واپس تشریف لے آئے، گیلانی صاحبؒ نعت سنا کر فارغ ہوئے تو حضرت شیخ صاحب مدظلہم نے کمالِ محبت سے ان کی آمد پر اظہارِ تشکر اور ان کی شاعری سے متعلق تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''یہ سلمان گیلانی صاحبؒ ایسے نہیں ہیں کہ کسی کو ایسے ہی مل جائیں، ان سے ملنے کیلئے، اور ان کے اشعار سننے کے لیے بہت قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائے، ان کے کاموں میں برکت عطا

فرمائے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو مدح کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، اوران کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو عشق اور محبت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس میں مزید ترقی عطا فرمائے، اور ہم لوگوں کو ان سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ انہوں نے جو نعت بھی کہی ہے، وہ دل سے کہی ہے، محبت سے کہی ہے، عشق سے کہی ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے ہمارے لیے بڑی نعمت ہیں اور اوران کا بہت بڑا احسان ہے کہ یہ یہاں تشریف لائے۔ پرسوں ان کا پیغام آیا تھا کہ میں کراچی آیا ہوا ہوں، کل میری ان سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے درخواست کی کہ ایک رات ہمیں بھی دے دیں۔ اور کچھ وقت ہمارے ساتھ گذار لیں۔ ہمارا بھی ایمان تازہ ہوجائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا جو جذبہ الحمدللہ، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور ہمارے طلبہ کو عطا فرمایا ہے، آپ کی تشریف آوری سے اسے تسکین ملے، تو انہوں نے بلا تامل بغیر کسی ادنیٰ تردد کے میری اس درخواست کو قبول کیا۔ میں نے کہا کہ میں گاڑی بھیج دوں تو انہوں نے کہا کہ میں خود ہی آجاؤں گا۔ خود ہی تشریف لائے، خود ہی زحمت فرمائی۔ اور پھر آپ دیکھیے کہ ہم سب کو کس طرح محظوظ فرمایا۔ اور کیا جذبہ کردیا؛ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق ومحبت کا جذبہ، دین کی محبت کا جذبہ، صحابہ کرام کی محبت کا جذبہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ختمِ نبوت کا جذبہ۔ میں اس پر کس طرح ان کا شکر ادا کروں؟ ان کے والد گرامی تھے حضرت سید امین گیلانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جتنی ختمِ نبوت کی تحریکیں ہوئی ہیں اور جتنے دین کے بڑے کام ہوئے ہیں، وہ ان کی آوازوں کی گونج میں ہوئے ہیں۔ ماشاء اللہ، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے والد صاحب کا صحیح جانشین بنایا ہے، اوران کی شاعری بھی شاعرانہ اعتبار سے غیر معمولی ہے، اب تو بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صحیح معنوں میں شاعرانہ ذوق رکھتے ہوں، لیکن ان کو اللہ تعالیٰ نے شعر کا بہت اعلیٰ سلیقہ عطا فرمایا ہے۔ میں ان کا تہِ دل سے ممنون ہوں، اور سب حضرات سے بھی گزارش ہے کہ ان کے لیے دعا کیا کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی عمر میں، علم میں اوران کے جذبۂ محبت میں اور علما کے ساتھ عشق میں بھی برکتیں عطا فرمائے اور دنیا اور آخرت میں انہیں صلاح وفلاح سے نوازے۔''

سید سلمان گیلانی صاحبؒ اس گفتگو کے دوران سر جھکائے عاجزی کی تصویر بنے رہے اور حضرت سے فرمایا کہ: ''آپ کا حکم میرے سر کا تاج - آپ کے نعلین میرے سر کا تاج۔ بعد ازاں انہوں نے اپنی یادداشتوں میں اس مجلس کے حوالے سے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے لکھا کہ:

''شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی کا دارالعلوم کراچی میں مجھے بلوا کر طلبہ کے سامنے کلام سننے کے بعد اس طرح تاثرات کا اظہار فرمانا اور دعائیں دینا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ مجھے اگر اپنے والد صاحبؒ کی نصیحت یاد نہ رہتی تو شاید میں نخوت اور کبر وغرور کا شکار ہوجاتا۔ وہ فرماتے تھے یاد رکھنا جب کبھی تمہارے سامنے کوئی تمہارا نام لے کر

''زندہ باد'' کے نعرے لگائے یا کوئی تعریفی کلمات ادا کرے تو فوراً **لاحول ولا قوۃ الا باللہ** پڑھنا اور اپنے دل کی طرف توجہ کر کے دیکھنا کہ اس میں تکبر کا کیڑا تو داخل نہیں ہو گیا۔ کیونکہ بڑائی صرف اللہ جل شانہ کی شان اور اسی کو زیبا ہے۔ اسی لمحے اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا اور اپنی ذات کی نفی کرنا۔ سو میں آج بھی اپنی مکمل نفی کرتا ہوں، میرے اندر اگر کوئی کمال ہے تو محض میرے اللہ کریم سبحانہ کا فضل ہے، اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیضانِ رحمت ہے۔ میرا اپنا کوئی کمال نہیں، میرے اندر اپنی کوئی خوبی نہیں۔ حضرت شیخ کو حق تعالی صحت وایمان والی لمبی زندگی نصیب کرے۔''

مسجد والی اس مجلس میں شرکت کے لیے جب گیلانی صاحبؒ مسجد تشریف لائے تو انہیں دیکھ کر طلبہ ان کے ارد گرد جمع ہو گئے، اس پر حضرت والا مدظلہم نے فرمایا کہ: ''جہاں شمع جلتی ہے پروانے خود بخود، ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ '' بہر حال مسجد میں منعقدہ اس مجلس سے پہلے بعد نمازِ مغرب حضرت والا مدظلہم کے گھر پر بھی خوب مجلس جمی جس میں سید سلمان گیلانی صاحبؒ اور حضرت والا نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ سلمان گیلانی صاحبؒ نے وہاں عشقِ حقیقی سے معمور ایک معرفت بھری یہ غزل بھی سنائی:

کسی آستاں پہ اے جاں، یہ سکونِ جاں نہیں ہے
ترے آستاں سے بہتر کوئی آستاں نہیں ہے
تری شب بخیر گذرے ، تو نہ میری داستاں سن
جسے سن کے نیند آئے، میری داستاں نہیں ہے
وہ نظر، نظر نہیں ہے جسے تو نظر نہ آئے
مجھے کوئی یہ بتائے تو بھلا کہاں نہیں ہے
میری آرزو کی کشتی، ہے خدا کے آسرے پر
کوئی ناخدا نہیں ہے، کوئی بادباں نہیں ہے
جو بھی ازرہِ تعلق وہ عطا کرے غنیمت
کوئی دکھ برا نہیں ہے ، کوئی غم گراں نہیں ہے
وہ جہاں جہاں سے گذرے، وہیں کہکشاں بنائی
'' مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے''

کہے کس سے دل کی سلماں ، سبھی لوگ اجنبی ہیں
کوئی آشنا نہیں ہے، کوئی ہم زباں نہیں ہے

اس مجلس سے متعلق انہوں نے لکھا کہ:

''شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی نے دارالعلوم کراچی اپنے دولت کدے پر بہت ہی پُرتکلف دعوت کا انتظام فرمایا اور مجھ ناچیز کو جو اعزاز و اکرام بخشا واللہ باللہ تاللہ میں ہیچ در ہیچ اس کا اہل نہیں ہوں۔ حضرت شیخ نے اصرار کے ساتھ کھانے کی دعوت دی اور ڈھیروں کلام سنا اور اپنا کلام پڑھ کر سنایا۔ اپنا مجموعۂ غزلیات ''گوشۂ تنہائی'' اپنی انتہائی متواضعانہ اور منکسرانہ تحریر کے ساتھ عاجز کو پیش فرمایا کہ:

''بشرفِ نظر عزیز گرامی جناب سلمان گیلانی صاحبؒ **کمبضع تمر الی هجر**''

وہ تین چار گھنٹے میری زندگی کا حاصل ہیں جو ان کی معیت میں گزرے، حضرت فرماتے رہے رات یہیں رُک جائیں مگر میری اگلے روز صبح صبح واپسی تھی اس لئے وہاں سے اجازت لینی پڑی۔ حضرت شیخ کے صاحبزادے اور پوتے بھی اس محفلِ سعید سے محظوظ ہوتے رہے۔ اللہ تعالیٰ سب کا حامی و ناصر ہو، سب کو حاسدین کے حسد سے محفوظ رکھے۔ آمین''

سید سلمان گیلانی مرحوم نے اپنی یادداشتوں میں ایک موقع پر حضرت والا مدظلہم سے اپنے کلام پر انعام وصول کرنے کی تفصیل بھی لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''وال سال برمنگھم برطانیہ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت ٹاؤن ہے، وہاں ایک اسلامک ادارہ ابوبکر ٹرسٹ کے نام سے قائم ہے، 2008 میں وہاں ایک سیرت کانفرنس تھی جس سے محترم جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کا خطاب تھا، اور میں نے وہاں اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں اپنا ہدیہ عقیدت مودت پیش کرنا تھا، پروگرام شروع ہوا، تلاوت کے بعد میرا نام پکارا گیا، مفتی صاحب اپنی نشست خاص پر تشریف فرما تھے اور ہمہ تن متوجہ تھے، میں نے نعت کا مطلع اپنے شاعرانہ ترنم میں پڑھا تو بے ساختہ سبحان اللہ، سبحان اللہ کی پاکیزہ داد سے میری حوصلہ افزائی فرمائی

عرش و کرسی سے بالا ہے بام آپ کا، آگے اللہ ہی جانے مقام آپ کا
آپ کے ساتھ صدیقؓ و فاروقؓ ہیں وہ ہے جنت جہاں ہے قیام آپ کا

ایک ایک شعر پر واہ واہ سبحان اللہ، ماشاء اللہ۔۔۔۔ اور جب یہ پڑھا

کیوں جچے میری نظروں میں شانِ کئی، سطوتِ قیصری، شوکتِ سنجری

ناز کرتا ہوں اپنے مقدّر پہ میں آپ آقا مِرے، میں غلام آپ کا

تو مفتی صاحب وجد میں جھومنے لگے، اپنا پرس نکالا، پرس میں سے نوٹ نکالا اور مٹھی بند کر لی، میں جان گیا کہ نعت کے بعد ہدیہ ملے گا، حضرت کا داد دینا ہی میرا سرمایہ ادب اور اثاثہ سخن تھا کہ اس پر آپ کے نقد ہدیہ کے حاصل ہونے کا تصور مجھے کبر وغرور کے گناہ کی طرف ایک قدم محسوس ہونے لگا، دل ہی دل میں استغفار پڑھا اور نعت کے بعد دو تین اشعار حضرت کے فقیہ العصر ہونے، ان کے علمی مقام و مرتبہ کی شان میں فی البدیہ پڑھ دیئے جواَب یاد نہیں، حضرت نے بٹوہ نکالا، بند مٹھی میں دبایا نوٹ واپس بٹوے میں ڈالا اور بٹوا جیب میں رکھ لیا، وا حسرتاہ! کیا کہہ سکتا ہوں۔ مفتی صاحب نے تقریر میں بھی نعت اور نعت گو کی تعریف کی، بعد میں فرمایا کہ شاہ جی آپ نے نعت پڑھی، میرا جی چاہا بیس پاؤنڈ ہدیہ نذر کروں پھر آپ نے میری مدح کر ڈالی تو اب مجھے ہدیہ پیش کرنا اچھا نہ لگا۔

دو سال کے بعد آپ جامعہ اسلامیہ لاہور مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ کے ہمراہ تشریف لائے تو مجھے وہاں دوپہر کے کھانے کے بعد نجی نشست میں وال سال والی نعت کی فرمائش کر دی اور مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ کی خصوصی توجہ بھی طلب کی، نعت پر اسی طرح داد وتحسین کے ٹوکرے بھر بھر کے نچھاور کئے، سیڑھیوں سے نیچے اترتے وقت میرا ہاتھ تھاما اور ہزار کا کڑکتا ہوا نیا نوٹ میرے دوسرے ہاتھ میں دے کر فرمایا وہ بیس پاؤنڈ کا نوٹ تھا اس وقت میرے پاس یہی ہے قبول کیجئے، نیچے طالب علم یہ منظر دیکھ رہے تھے، جب میں نیچے اترا تو مفتی صاحب حضرت مولانا مشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دفتر میں تشریف لے جا چکے تھے، ایک طالب علم جس کا نام ظہیر احمد ظہیر اعوان ہے جو میرے والد مرحوم کے سفر وحضر کا ساتھی رہا ہے حتی کہ آخری سفر کا بھی ساتھی اور اسی کی گود میں ان کے سانس کی ڈوری تن سے جدا ہوئی، میرے قریب آ کر مجھ سے لپٹ گیا اور کہنے لگا ذرا وہ نوٹ دکھائیں اس نے جھٹ وہ نوٹ پکڑ کر اپنی جیب میں ڈالا اور دو نوٹ پانچ پانچ سو کے میری جیب میں ڈال دیے کہ آپ کو تو بہت سے بزرگ دینے والے ہیں اس نوٹ پر ہمارا حق ہے، اس کی عقیدت کے مقابلے میں مجھے اپنی عقیدت بہت خام نظر آئی، میں نے اس کے دونوں نوٹ اس کی جیب میں ٹھونسے اور اس کے والہانہ پن، بے تکلفی اور عقیدت کے انداز پر رشک کرتا ہوا جامعہ سے باہر نکل آیا، سلام ہو مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے تقوی پر، سلام ہو ان کے ذوق نعت پر اور سلام ہو حافظ ظہیر احمد ظہیر کے حسن عقیدت پر''

ایک مرتبہ انہوں نے حضرت والا مدظلہم سے روحانی بیماریوں کے بارے میں کچھ گفتگو کی اور جادو، آسیب، بدنظری کے لیے کوئی خصوصی عمل پوچھا، اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت شیخ نے کمال شفقت سے فرمایا کہ میں اپنے ہاتھ سے ایک عمل لکھ کے دیتا ہوں جو میرے والد مفتی اعظم مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ نے عطا فرمایا تھا۔ اور پھر آپ نے مجھے اپنے لیٹر ہیڈ پہ اپنے دست مبارک سے لکھ کر دیا۔ وہ وظیفہ یہ تھا:

أَعُوذُ بِوَجْهِ اللهِ الْعَظِيمِ الَّذِي لَيْسَ شَيْءٌ أَعْظَمَ مِنْهُ، وَبِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ، وَبِأَسْمَاءِ اللهِ الْحُسْنَى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ۔

شیخ نے فرمایا ہر فرض نماز کے بعد ایک مرتبہ پورے خشوع وخضوع اور ادب ویقین کے ساتھ پڑھتے رہیں اور مداومت اختیار کریں۔ ان شاء اللہ بہت جلد اثرات مرتب ہونگے۔''

سید سلمان گیلانی صاحبؒ کے سانحہ ارتحال پر اکابر علماء کرام نے بھی بڑا صدمہ محسوس کیا، وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے صدر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم، سینئر نائب صدر حضرت مولانا انوار الحق صاحب دامت برکاتہم، ناظم اعلیٰ وفاق حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب مدظلہم اور دیگر حضرات نے ملک کی نامور دینی وملی شخصیت، تحریک ختم نبوت کے سرگرم رہنما سید سلمان گیلانی صاحبؒ کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے، اپنے تعزیتی بیان میں قائدین وفاق المدارس نے کہا کہ سید سلمان گیلانی مرحوم نے ساری زندگی بارگاہ رسالت میں ہدیہ نعت، صحابہ کرام کی منقبت اور دینی وملی حوالوں سے نغموں اور ترانوں کے ذریعے قوم میں عشق رسالت اور جذبہ حریت پیدا کیا، قائدین وفاق نے سید سلمان گیلانیؒ کے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ، دینی مدارس کی خدمت اور ملک میں اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے کردار کو بھی سراہا، انہوں نے کہا کہ مرحوم نہایت مخلص اور ملت کا درد رکھنے والے شخص تھے، ان کی دینی وملی خدمات ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہیں، گیلانی صاحب مرحوم کی وفات سے دینی حلقوں بالخصوص تحریک ختم نبوت کو بڑا نقصان پہنچا ہے، ان کی خدمات ہمیشہ مشعل راہ رہیں گی اور نئی نسل کے لئے جذبۂ تحفظ ختم نبوت کا پیغام دیتی رہیں گی۔

سید سلمان گیلانی صاحبؒ 1951 میں سادات کالونی شیخوپورہ میں پیدا ہوئے، زندگی بھر ادب، مذہب، اور سماجی مسائل پر لکھتے رہے، 1974 کی تحریک ختم نبوت میں بھرپور حصہ لیا، شگفتہ مزاج، صاف دل، ہنس مکھ اور

باوقار شخصیت کی تمام خوبیوں کا مرقع تھے، سید سلمان گیلانی کی وفات پر ادبی حلقے سوگوار ہیں، اہل خانہ کے مطابق سید سلمان گیلانی صاحبؒ دل اور جگر کے عارضے میں مبتلا تھے، شیخ زید ہسپتال لاہور میں زیر علاج تھے، کل عمر 74 برس ہوئی، مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں شامل ہیں، نماز جنازہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محبّ النبی صاحب مدظلہم کی اقتدا میں ادا کی گئی جس میں سیاسی و مذہبی شخصیات سمیت عزیز و اقارب بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

مولائے کریم سے دعاء ہے کہ وہ سید امین گیلانی اور سید سلمان گیلانی رحمۃ اللہ علیہما کی کامل مغفرت فرما کر درجاتِ عالیہ سے سرفراز فرمائے اور لواحقین کو صبر و اجر کی بہترین دولت سے مالا مال فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

بقیہ: سافٹ ویئر کی ماہیت وحقیقت

"پروگرامنگ کمپیوٹر کو بتا رہی ہے کہ اسے اپنا کام کیسے کرنا چاہیے"۔

"پروگرامنگ لینگویج وہ زبانیں ہیں جو کمپیوٹر کے ساتھ بات چیت کے لیے استعمال ہوتی ہیں جن کے ذریعے سافٹ ویئر، ویب سائٹس، ایپلی کیشنز اور دیگر ٹیکنالوجی بنائی جاتی ہے۔ اس کے ذریعے سے لوگوں کو اجازت ملتی ہے کہ وہ کمپیوٹر کو ہدایات دے سکیں تاکہ وہ روزمرہ کی ٹیکنالوجی کی پیروی اور اس کو بنا سکیں"۔

"سافٹ ویئر ہدایات کا ایک مجموعہ ہے جو کمپیوٹر، ویب پر مبنی ایپلیکیشن، یا دیگر آلات کو بتاتا ہے کہ کیا کرنا ہے"۔

اسٹینفورڈ یونیورسٹی، امریکہ کے مشہور پروفیسر ڈونلڈ ای کنتھ نے کئی جلدوں پر مشتمل کتاب بعنوان "کمپیوٹر پروگرام ایز این آرٹ" تحریر کی ہے جو کہ کمپیوٹر سائنس کی بنیادی کتابوں میں سے ایک ہے۔ کتاب کے عنوان سے ہی واضح ہوتا ہے کہ کمپیوٹر پروگرامنگ ایک فن اور ہنر ہے۔ یہ پروفیسر اپنے ایک تحقیقی مقالے میں کمپیوٹر پروگرامنگ کو ایک فن اور ہنر کے طور پر متعارف کرواتے ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ "کمپیوٹر پروگرامنگ ایک فن یا ہنر ہے"۔

نیز یہ بات بھی قارئین کے ذہن میں رہے کہ پروگرامنگ لینگویج کو بطور آلہ کے استعمال کیا جاتا ہے اور ان کو خام مال نہیں کہا جاسکتا، جس کو درجِ ذیل اقتباس مزید واضح کرتا ہے۔ "پروگرامنگ کے اہم ٹولز عام مقصد کی کمپیوٹر لینگویجز ہیں جیسے جاوا، سی شارپ، سی، سی پلس پلس، اسکالا اور روبی"۔ (باقی آئندہ)

سافٹ ویئر کی ماہیت وحقیقت

تحریر وتخریج: ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی

جناب ڈاکٹر مبشر رحمانی صاحب عالمی شہرت یافتہ اور ایوارڈ یافتہ سائنٹسٹ ہیں۔آج کی ڈیجیٹیل دنیا کی حرکیات سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ہماری زندگی کے بیشتر معاملات اب ڈیجیٹیل ڈنیا سے وابستہ ہو چکے ہیں۔معیشت وتجارت کی بہت سی راہ داریاں ڈیجیٹیل نظام کی بھول بھلیوں سے ہوکر گزرتی ہیں۔ظاہر ہے ان کے ساتھ اب شرعی مسائل بھی وابستہ ہیں،اس لیے ہمارے علماء ومفتیان کرام کو ڈیجیٹیل مارکیٹ کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے بھی کماحقہ واقف ہونا ضروری ہے۔جناب مبشر رحمانی صاحب کا یہ مقالہ ایک قابل مطالعہ تحریر ہے۔(مدیر)

❁❁❁

جس طریقے سے حقِ سند ایجاد یعنی پیٹنٹ،تجارتی علامت یعنی ٹریڈ مارک،کاپی رائٹ، برانڈ،حقِ تصنیف یا تالیف کو انٹیلیکچول پراپرٹی مانا جاتا ہے،اسی طریقے سے سافٹ ویئر کو بھی عالمی سائنسی وقانونی دنیا میں ایک قسم کی انٹیلیکچول پراپرٹی یعنی فکری ملکیت مانا جاتا ہے جو کہ کمپیوٹر پروگرامرز وسافٹ ویئر انجینئرز کی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت وجود میں آتے ہیں۔سافٹ ویئر بنانے میں کمپیوٹر پروگرامرز کی صرف اور صرف تخلیقی صلاحیتوں کا دخل ہوتا ہے۔سافٹ ویئر (کمپیوٹر کوڈ) کو کاپی رائٹ کی مدد سے پوری دنیا میں قانونی طور پر محفوظ کیا جاتا ہے اور اسے انٹیلیکچول پراپرٹی یعنی فکری ملکیت مانا جاتا ہے۔پوری دنیا میں سافٹ ویئر کی خرید وفروخت عمومی طور پر بطور حقوق کے ہی ہوتی ہیں۔سافٹ ویئر مادی نہیں ہوتا اور اس کا کوئی حسی وجود نہیں ہوتا۔سافٹ ویئر معنوی ہوتا ہے،تخیلاتی ہوتا ہے اور اس کو حقیقی اشیاء پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔سافٹ ویئر کو ڈیجیٹل یا ورچول اس وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ مجازی ہوتے ہیں،حقیقی وجود نہیں رکھتے۔

ذیل میں راقم کچھ معتبر ومستند سائنسی وقانونی حوالہ جات پیش کرتا ہے جو کہ سافٹ ویئر کو انٹیلیکچول پراپرٹی ثابت کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ سافٹ ویئر کو بطور کاپی رائٹ قانونی طور پر محفوظ کیا جاتا ہے۔

تالس گروپ، جو کہ ایک فرنچ ملٹی نیشنل کمپنی ہے وہ سافٹ ویئر کے بارے میں تحریر کرتی ہے کہ:

"سافٹ ویئر انٹلیکچوئل پراپرٹی (سافٹ ویئر آئی پی) کوئی بھی کمپیوٹر کوڈ، پروگرام، یا ایپلیکیشن ہے جسے کاپی کرنے، چوری کرنے، پووائزننگ، یا مالک کی طرف سے اجازت نہ دینے والے دوسرے استعمال کے خلاف

قانون کے ذریعے تحفظ حاصل ہے۔ سافٹ ویئر آئی پی اس کمپنی سے تعلق رکھتا ہے جس نے یا تو سافٹ ویئر بنایا یا اس کے حقوق خریدے۔ کسی اور کے غیر مجاز استعمال کو غیر قانونی سمجھا جاتا ہے"۔

"کیا سافٹ ویئر کو ذہنی، فکری، تخلیقی ملکیت سمجھا جاتا ہے؟

جی ہاں! ذہن کے ذریعہ تخلیق کردہ کسی بھی قسم کی غیر حسی ملکیت، جیسے ایجادات، آرٹ اور ادب کے کام، ڈیزائن، نام، یا تصاویر کو دانشورانہ (ذہنی، فکری یا تخلیقی) ملکیت سمجھا جا سکتا ہے۔ سافٹ ویئر اس زمرے میں آتا ہے"۔

امریکہ کا پیٹنٹ اینڈ ٹریڈ مارک آفس سافٹ ویئر کے متعلق یہ تحریر کرتا ہے کہ

"کاپی رائٹ وفاقی طور پر عطا کردہ پراپرٹی کا حق ہے جو حقوق کے حاملین کو ان کی تصنیف کے اصل کاموں کے بعض غیر مجاز استعمال سے بچاتا ہے۔ تحفظ کے لیے سبجیکٹ میٹر کو کاپی رائٹ ایکٹ 1976 میں بیان کیا گیا ہے۔ کاپی رائٹ کے قابل کاموں میں ادبی، ڈرامائی، موسیقی، اور فنکارانہ کام جیسے کتابیں، ڈرامے، موسیقی، دھن، پینٹنگز، مجسمے، ویڈیو گیمز، فلمیں، ساؤنڈ ریکارڈنگ، اور سافٹ ویئر شامل ہیں"۔

دنیا کے مختلف محققین اور سائنسدان سافٹ ویئر کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ

"سافٹ ویئر کا تعین کمپنی کے انٹلیکچوئل پراپرٹی (آئی پی) پورٹ فولیو کے اثاثے کے طور پر کیا جاتا ہے"۔

"کاپی رائٹ کا قانون تصنیف کے کاموں کی حفاظت کرتا ہے، جن میں ادبی کام شامل ہیں۔ ناول، غیر افسانوی نثر، شاعری، اخباری مضامین اور اخبارات، میگزین کے مضامین اور رسالے، کمپیوٹر سافٹ ویئر، سافٹ ویئر دستاویزات اور مینول، تربیتی کتابچے، دیگر دستور العمل، کیٹلاگ، بروشر، اشتہارات (متن) اور تالیفات جیسے کاروباری ڈائریکٹریز"۔

امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ یہ تحریر کرتا ہے کہ

"فکری ملکیت کیا ہے؟:

فکری ملکیت کسی کی تخلیقی صلاحیتوں کی عکاسی کرتی ہے۔ فکری ملکیت ہمارے چاروں طرف ہیں۔ یہ معجزاتی ادویات، ایک نیا کمپیوٹر گیم، ایک فلم، یا زیادہ ایندھن کی بچت والی کار کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ فکری ملکیت کے قانون کے تین اہم شعبے ہیں: ٹریڈ مارک، پیٹنٹ، اور کاپی رائٹ۔

"کاپی رائٹ"

کاپی رائٹ قانون کے ذریعہ تصنیف کے اصل کاموں کے لئے دیا جاتا ہے جو اظہار کے ایک ٹھوس ذریعہ میں

طے شدہ ہیں۔کاپی رائٹ اصل کاموں جیسے ادبی، ڈرامائی، موسیقی اور فنکارانہ کاموں کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔شاعری، ناول، فلمیں، گانے اور کمپیوٹر سافٹ ویئر چند مثالیں ہیں جنہیں کاپی رائٹ کے ذریعے محفوظ کیا جاسکتا ہے"۔

آئرلینڈ کا ڈیپارٹمنٹ آف انٹر پرائز، ٹورزم، اور ایپلائیمنٹ سافٹ ویئر کے متعلق یہ تحریر کرتا ہے کہ

"انٹلیکچوئل پراپرٹی سے مراد ذہن کی تخلیقات ہیں، جیسے ایجادات (پیٹنٹ)؛ ادبی اور فنکارانہ کام (کاپی رائٹ)؛ نئی مصنوعات کے ڈیزائن (صنعتی ڈیزائن)؛ اور برانڈ کے نام، علامتیں، یا لوگوز جو مصنوعات اور خدمات کو ایک انڈر ٹیکنگ سے دوسرے سے الگ کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں (ٹریڈ مارک)"

"رسمی انٹیلیکچول پراپرٹی حقوق میں پیٹنٹس، تجارتی نشانات (ٹریڈ مارک) اور صنعتی ڈیزائن شامل ہیں جنہیں اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ رجسٹرڈ ہو سکتے ہیں۔کاپی رائٹ دماغ کی تخلیقات سے متعلق ایک مختلف قسم کی دانشورانہ (فکری) ملکیت ہے اور اسے روزمرہ کی زندگی میں تخلیقی کاموں جیسے کتابوں، فلموں، موسیقی، آرٹ اور سافٹ ویئر کے ساتھ ساتھ کاروں، کمپیوٹرز اور ادویات جیسی دنیاوی چیزوں میں دیکھا جاتا ہے"۔

کینیڈا کی حکومت سافٹ ویئر کے حقوق سے متعلق یہ تحریر کرتی ہے کہ

"کاپی رائٹ اصل ادبی اور فنکارانہ کاموں کی حفاظت کرسکتا ہے، جن میں شامل ہیں سافٹ ویئر پروگرام، ڈیٹا اکٹھا کرنا، ویب سائٹ کا متن اور ویب سائٹس، اور تصاویر یا گرافکس۔

کمپیوٹر سافٹ ویئر کو ایک ادبی کام سمجھا جاتا ہے جو کاپی رائٹ کے تابع ہے۔کاپی رائٹ دوسروں کو آپ کے پروگراموں کی کاپیاں بنانے سے روک سکتا ہے، لیکن دوسرے پھر بھی اپنے پروگرام لکھ سکتے ہیں اور ان کی حفاظت کرسکتے ہیں جو مختلف بنیادی کوڈ کے ذریعے آپ کی طرح ہی کریں گے۔نوٹ کریں کہ وہ ڈیٹا جو "اصل" مجموعہ کا حصہ نہیں ہے اسے محض حقائق کے طور پر شمار کیا جاسکتا ہے، اور آپ حقائق کا پی رائٹ نہیں کرسکتے"۔

امریکہ کی اسٹینفورڈ یونیورسٹی سافٹ ویئر کے متعلق یہ تحریر کرتی ہے کہ

"اصل سافٹ ویئر کوڈ کاپی رائٹ شدہ دانشورانہ املاک کے تحت آتا ہے۔عام طور پر، سافٹ ویئر کے کاپی رائٹ کے مالک کو سافٹ ویئر کو دوبارہ تیار کرنے (کاپی) کرنے، مشتق کام تیار کرنے، فروخت کے ذریعے کاپیاں تقسیم کرنے کا خصوصی حق حاصل ہے۔اسٹینفورڈ یونیورسٹی میں، سافٹ ویئر کی تقسیم اور لائسنسنگ کو کئی طریقوں سے سنبھالا جاسکتا ہے، اور بہت زیادہ انحصار تخلیق کاروں کے ان پٹ پر ہوتا ہے"۔

برطانیہ کی کمپیوٹر سوسائٹی یہ تحریر کرتی ہے کہ

"جب آپ سافٹ ویئر خریدتے ہیں، جیسے انٹرنیٹ سیکیورٹی، آپ بنیادی طور پر لائسنسنگ معاہدے کی شرائط

کے ساتھ مشروط سافٹ ویئر استعمال کرنے کا لائسنس خرید رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح جیسے آپ سافٹ ویئر خریدتے ہیں، آپ اپنے سافٹ ویئر کو لائسنس دے سکتے ہیں۔"

انٹیلکچول پراپرٹی آفس آف آئرلینڈ (حکومتِ آئرلینڈ کا قومی ادارہ) یہ تحریر کرتا ہے کہ

"انٹلیکچوئل پراپرٹی ایک جائیداد کا حق ہے جو قانون میں قائم کیا گیا ہے تاکہ دوسروں کو اجازت کے بغیر آپ کی فکری تخلیقات کو استعمال کرنے سے روکا جا سکے۔ آئی پی کے حقوق آپ کو اپنے اختراعی اور تخلیقی خیالات کو تجارتی بنانے اور ان کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتے ہیں۔ آئی پی ان حقوق پر مشتمل ہے: پیٹنٹ، کاپی رائٹ، ٹریڈ مارکس، اور ڈیزائن۔

کاپی رائٹ میں یہ چیزیں شامل ہیں: آڈیو ویزول کام، تصاویر، گرافک، آرکیٹیکچر، ڈیٹا بیس، سافٹ ویئر، ڈیزائن، لٹریچر، ناول، نظم، ڈرامے، میوزک اور ویڈیو، اور ڈرامے کے کام شامل ہیں۔"

آئرلینڈ کا انٹیلکچول پراپرٹی آفس یہ تحریر کرتا ہے کہ

"کاپی رائٹ ایک قانونی اصطلاح ہے، جو کہ مصنفین/تخلیق کاروں کے کاموں کی کچھ اقسام کو دیے گئے حقوق کی وضاحت کرتی ہے۔ کاپی رائٹ کا تحفظ درج ذیل کاموں تک پھیلا ہوا ہے:

- اصل ادبی، ڈرامائی، موسیقی یا فنکارانہ کام،
- آواز کی ریکارڈنگ، فلمیں،
- نشریات، کیبل پروگرام،
- شائع شدہ ایڈیشنوں کا ٹائپوگرافیکل انتظام،
- کمپیوٹر پروگرامز،
- اصل ڈیٹا بیس۔"

یورپی یونین کے قوانین میں کہا گیا ہے کہ "یورپی یونین کے ممالک کو کاپی رائٹ کے ذریعے کمپیوٹر پروگراموں کی حفاظت کرنی چاہیے"۔

سافٹ ویئر کی تعریف، ماہیت وحقیقت:

سافٹ ویئر کی ایک سادہ تعریف (آئی بی ایم کے مطابق) یہ ہے کہ

"سافٹ ویئر ہدایات یا کمپیوٹر پروگرامز کا مجموعہ ہوتا ہے جو کہ کمپیوٹر کو بتاتا ہے کہ کیا کرنا ہے"۔

سائنسدان اور محققین کمپیوٹر پروگرامز کی تعریف اس طریقے سے کرتے ہیں کہ

"کمپیوٹر پروگرام، کمپیوٹر کو دی گئی ہدایات کا نام ہے۔ آپ کمپیوٹر کو پروگرام کے ذریعے بتاتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔ پروگراموں کے بغیر، ایک عام مقصد کا کمپیوٹر جیسے پرسنل کمپیوٹر ایک خالی مشین ہے۔ کمپیوٹر انسانی زبانیں اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ لہذا، آپ کو کمپیوٹر کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے کمپیوٹر کی پروگرامنگ لینگویج استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے"۔

سائنسدان اور محققین کمپیوٹر سافٹ ویئر کی تعریف اس طریقے سے بھی کرتے ہیں۔

"کمپیوٹر سافٹ ویئر، جسے کمپیوٹر پروگرام یا ایپلی کیشنز بھی کہا جاتا ہے، ہدایات کے سیٹ ہیں جو پروگرامرز کے ذریعہ لکھے جاتے ہیں"۔

برٹانیکا انسائیکلو پیڈیا میں سافٹ ویئر کی تعریف اس طریقے سے کی گئی ہے کہ:

"سافٹ ویئر، ہدایات جو کمپیوٹر کو بتاتی ہیں کہ کیا کرنا ہے"۔

مائیکروسافٹ، سافٹ ویئر کی تعریف اس طریقے سے کرتا ہے کہ:

"سافٹ ویئر سے مراد وہ پروگرام، ڈیٹا اور ہدایات ہیں جو کمپیوٹر اور دیگر الیکٹرانک آلات کو مخصوص کام انجام دینے کے قابل بناتے ہیں"۔

"سافٹ ویئر (یعنی وہ ہدایات جو آپ کمپیوٹرز کو کام کرنے اور فیصلے کرنے کے لیے لکھتے ہیں) جو کمپیوٹرز (جسے اکثر ہارڈ ویئر کہا جاتا ہے) کو کنٹرول کرتا ہے۔"

"ہدایات کا مجموعہ جو ہارڈ ویئر کو بتاتا ہے کہ کسی خاص کام کو کیسے انجام دینا ہے اسے سافٹ ویئر کہتے ہیں۔ ہارڈ ویئر کے برعکس، ہم کسی سافٹ ویئر کو دیکھ یا چھو نہیں سکتے"۔

مندرجہ بالا سائنسی معتبر و مستند حوالہ جات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ سافٹ ویئر کی ماہیت و حقیقت کیا ہے یعنی یہ کہ سافٹ ویئر کمپیوٹر کو دی گئی ہدایات کا مجموعہ ہوتا ہے۔

کمپیوٹر پروگرامر محنت کرتا ہے، سوچتا ہے، اپنی دماغی صلاحیتیں لگاتا ہے اور پھر وہ کمپیوٹر کو ایسی ہدایات جاری کرتا ہے جس سے کمپیوٹر کوئی فائدہ مند کام انجام دیتا ہے اور اسی فائدہ مند کام کو سافٹ ویئر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جو سافٹ ویئر تحریر کرنے والا شخص جتنا ماہر ہوگا، اتنی ہی جلدی اور اچھا سافٹ ویئر کوڈ وہ تحریر کرے گا۔ اسی وجہ سے بعض سافٹ ویئر ہاؤسز میں کمپیوٹر پروگرامرز کو ان کی تنخواہ اس حساب سے دی جاتی ہے کہ وہ کتنے ہزار لائنوں کا

کوڈ تحریر کرتے ہیں، کتنی جلدی تحریر کرتے ہیں، کمپیوٹر کوڈ کتنا مختصر و جامع لکھتے ہیں اور کتنا تخلیقی لکھتے ہیں۔ اسی نسبت سے اگر ایک سافٹ وئیر تحریر کرنے والا اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کرتا ہے تو وہ ایسا سافٹ وئیر بھی تحریر کر سکتا ہے جو کہ بہت زیادہ لوگوں میں مشہور ہو جائے۔ خلاصہ یہ کہ سافٹ وئیر بنانے والا اپنی دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کمپیوٹر سافٹ وئیر تحریر کرتا ہے اور یہ خالصتاً تخلیقی کام تصور کیا جاتا ہے۔

واٹس اپ کا سافٹ وئیر ایک رابطہ کرنے کا سافٹ وئیر ہے۔ اس کو بنانے کے لیے کمپیوٹر پروگرامز کی ایک ٹیم نے ہزاروں کی تعداد میں ہدایات و پروگرامز لکھے ہیں اور ان ہدایات و پروگرامز کے مجموعے کو جب اکٹھا چلایا جاتا ہے تو اس سے واٹس اپ کا سافٹ وئیر وجود میں آتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ پہلے کمپیوٹر پروگرامز نے یہ ہدایات لکھی ہوں گی کہ جیسے ہی کوئی واٹس اپ کے آئکن (علامت یا صورت) کو کمپیوٹر یا موبائل میں کلک کرے تو سب سے پہلے اس کے اسکرین کے سامنے ہرے رنگ کی اسکرین آجائے اور اس میں اس کو مختلف ناموں کی فہرست نظر آئے اور مختلف بٹن نظر آئیں۔ پھر جب وہ کسی شخص کے رابطہ کے بٹن پر کلک کرے تو اس شخص سے اس کا رابطہ ہو جائے وغیرہ۔ اس طریقے سے ہزاروں لاکھوں لائنوں کا کوڈ (ہدایات یا پروگرامز) کو اکھٹا کر کے سافٹ وئیر بنایا جاتا ہے۔

مختلف اقسام کے سافٹ وئیر ہوتے ہیں مثلاً سسٹم سافٹ وئیر، پروگرامنگ سافٹ وئیر، ایپلی کیشن سافٹ وئیر اور ایمبیڈڈ سافٹ وئیر۔ سافٹ وئیر بنانے میں کئی مراحل شامل ہوتے ہیں جس میں سافٹ وئیر کی پلاننگ، ڈیزائن، نفاذ یا تکمیل، اور اس کی نگہداشت وغیرہ شامل ہیں۔

سافٹ وئیر بنانے میں جس چیز کا دخل ہو سکتا ہے، یہ اس سافٹ وئیر کی ساخت اور قسم پر انحصار کرتا ہے۔ جب ہم ایک عام سافٹ وئیر کی بات کرتے ہیں تو اس کے بنانے میں جو چیزیں شامل ہوتی ہیں وہ صرف کمپیوٹر ہدایات یا کمپیوٹر پروگرامز ہوتے ہیں۔ لازمی بات ہے کہ یہ کمپیوٹر ہدایات یا کمپیوٹر پروگرامز کس طریقے سے تحریر کیے جائیں گے اس کو سیکھنا پڑتا ہے۔ سافٹ وئیر کو چلانے کا انحصار مختلف سافٹ وئیر مثلاً لائبریریز، آپریٹنگ سسٹم، اے پی آئی، پروگرامنگ لینگویجز، فریم ورک، ڈیٹا وغیرہ پر ہوتا ہے۔ نیز سافٹ وئیر کو چلانے کا انحصار ہارڈ وئیر اور کس ماحول (آپریٹنگ سسٹم وغیرہ) میں وہ چلے گا، اس پر بھی ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایک عام سادہ سے سافٹ وئیر بنانے میں صرف "کمپیوٹر ہدایات یا کمپیوٹر پروگرامز" کا دخل ہوتا ہے۔

عمومی طور پر کسی ڈیجیٹل چیز کے "ڈیجیٹل وجود" کا تعین اس کے قابلِ انتفاع ہونے سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ہم ایک لفظ "ج" کمپیوٹر پر تحریر کریں، یقیناً یہ لفظ کمپیوٹر میں ڈیجیٹل طور پر لکھا گیا ہے مگر اس لفظ کا "ڈیجیٹل وجود" تسلیم

نہیں کیا جائے گا اس معنی میں کہ یہ محض ایک لفظ "ج" ہے اور اس لفظ "ج" سے کوئی انتفاع حاصل نہیں کیا جا سکتا لہذا یہ لفظ قیمتی یعنی مال نہیں کہلایا جائے گا اور کوئی اس ڈیجیٹل لفظ "ج" کی خرید وفروخت بھی نہیں کرے گا اور یہ لفظ "ج" اپنی موجودہ صورت میں سافٹ وئیر نہیں کہلایا جائے گا۔ اب مختلف الفاظ کو اس طریقے سے یکجا کیا جائے کہ اس سے ایسا سافٹ وئیر وجود میں آئے جس سے کوئی فائدہ اٹھایا جا سکے تو پھر ہمیں یہ کہیں گے کہ یہ سافٹ وئیر ہے اور اس سافٹ وئیر کا "ڈیجیٹل وجود" ہے۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ سافٹ وئیر کے ڈیجیٹل وجود کو حقیقی وجود اور حسی وجود پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی سافٹ وئیر کمپیوٹر پروگرامر کی ذہن سے تخلیق کردہ ہدایات ہیں اور ان کو بطور حق "کاپی رائٹ" کے تحت خرید وفروخت کیا جاتا ہے۔ سافٹ وئیر بجلی کی طرح نہیں ہے کہ اس کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا جا سکے۔ سافٹ وئیر کو کمپیوٹر پروگرام کی صلاحیت کی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور یہ کمپیوٹر پروگرام کی دماغی صلاحیتوں پر منحصر کرتا ہے اور سافٹ وئیر کوئی مال نہیں ہے۔ کمپیوٹر پروگرامر کی تخلیقی صلاحیتوں کو سافٹ وئیر کہا جا سکتا ہے۔

سافٹ وئیر کا خام مال کیا ہوگا؟:

اگر کوئی یہ سوال پوچھے کہ سافٹ وئیر کا خام مال کیا ہے؟ تو یہ خام مال والی مثال اس پر لاگو نہیں ہوگی کیونکہ سافٹ وئیر کمپیوٹر کو دی گئی ہدایات کا نام ہے اور یہ کمپیوٹر پروگرامر کی دماغی صلاحیتوں کی وجہ سے وجود میں آتا ہے اور اس میں کوئی خام مال شامل نہیں ہوتا۔ پھر بھی اگر کوئی سافٹ وئیر کی ماہیت کو خام مال کی مثال سے سمجھنے کی کوشش کرے تو صرف یہ کہا جائے گا کہ سافٹ وئیر کا خام مال "کمپیوٹر ہدایات یا کمپیوٹر پروگرامز" کو کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً واٹس اپ سافٹ وئیر کا خام مال وہ "کمپیوٹر ہدایات یا کمپیوٹر پروگرامز" ہیں جن کی بنیاد پر واٹس اپ وجود میں آیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ چونکہ ہم نے اس واٹس اپ سافٹ وئیر کو بناتے وقت اپنا کمپیوٹر اور انٹرنیٹ بھی استعمال کیا تھا، لہذا یہ بھی خام مال میں شامل ہیں۔ نیز ہم یہ بھی نہیں کہیں گے کہ چونکہ ایک سافٹ وئیر انجینئر کو سافٹ وئیر بنانے میں بجلی بھی چاہیے ہوتی ہے لہٰذا یہ بجلی بھی اس سافٹ وئیر کا خام مال ہے اور یہ سافٹ وئیر انجینئر بھی بذاتِ خود اس سافٹ وئیر کا خام مال ہے۔ یعنی ایک گھر کا خام مال سیمنٹ، سریا، اینٹ، بجری ہوتے ہیں۔ اس گھر کے بنانے والے مزدور یا اس سیمنٹ، اینٹ، بجری وغیرہ کو لانے والا ٹرک اس کا خام مال نہیں تصور کیا جاتا۔ عام معنوں میں "کمپیوٹر ہدایات یا کمپیوٹر پروگرامز" آلات نہیں ہیں، اور کوئی مادی یا حسی چیز نہیں ہیں لہٰذا ان کو خام مال تصور نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ تو کمپیوٹر پروگرامرز کی دماغی صلاحیتوں سے وجود میں آتا ہے۔

بعض لوگ یہ اشکال کر سکتے ہیں کہ "سافٹ وئیر بنانے کی صورت میں سافٹ وئیر بنانے والا اپنی

ذہنی اور فکری بنیاد پر اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو کام میں لا کر ایک نیا سافٹ ویئر وجود میں لاتا ہے اور اس سافٹ ویئر بنانے میں ذہنی صلاحیتوں کے علاوہ کچھ ڈیجیٹل مواد بھی شامل ہوتا ہے"۔ یہاں پر یہ اشکال کرنے والوں سے بنیادی غلطی ہو رہی ہے اور وہ یہ کہ یہ "ڈیجیٹل مواد" دراصل کمپیوٹر پروگرامز اور ہدایات ہی ہوتی ہیں اور کمپیوٹر پروگرامرز کی دماغی صلاحیتوں سے وجود میں آتی ہیں۔ لہذا یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ سافٹ ویئر کا خام مال میں "ڈیجیٹل مواد" شامل ہے۔

وہ حضرات جو کہ کمپیوٹر سائنس و سافٹ ویئر کی سطحی معلومات رکھتے ہیں، بعض مرتبہ وہ یہ کہتے ہیں کہ سافٹ ویئر مختلف پروگرامنگ لینگوئج سے مل کر بنتا ہے اور پروگرامنگ لینگوئج اس کا خام مال تصور کیے جا سکتے ہیں۔ یہ بات سائنسی طور پر سراسر غلط ہے اور سافٹ ویئر کی ماہیت و حقیقت اور صحیح و مستند سائنسی معلومات کے نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا ہے۔ پروگرامنگ لینگوئج کو سافٹ ویئر کا خام مال نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی سافٹ ویئر مختلف پروگرامنگ لینگوئج سے مل کر بنتا ہے۔

پروگرامنگ لینگوئج وہ "ہنر" اور "صلاحیت" ہے جس کے ذریعے سے کمپیوٹر پروگرام (سافٹ ویئر) تحریر کیا جاتا ہے اور جس کے ذریعے سے کمپیوٹر کو ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔ بے تحاشہ کتب اور سائنسی تحقیقی مقالے کمپیوٹر پروگرامنگ کو بطور فن اور ہنر کے متعارف کرواتے ہیں۔ ذیل میں ہم چند مستند و معتبر سائنسی حوالہ جات پیش کرتے ہی جن سے ثابت ہوتا ہے کہ پروگرامنگ ایک فن اور ہنر ہے جس کے ذریعے سے کمپیوٹر کو ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔ ان تمام مستند سائنسی حوالہ جات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "ہنر" اور "صلاحیت" کو سافٹ ویئر کا خام مال نہیں کہا جا سکتا اور اگر کوئی ایسا کہتا ہے تو اسے سافٹ ویئر کی ماہیت و حقیقت سے متعلق سخت مغالطہ ہوا ہے۔

"پروگرامنگ کمپیوٹر کو ہدایات لکھنے کا ایک فن ہے"۔

"پروگرامنگ کمپیوٹر کو ہدایت دینے کی صلاحیت ہے"۔

"کمپیوٹر ڈیٹا کو پروسس کرتے ہی ایک خاص ہدایات کی ترتیب کے ذریعے جسے کمپیوٹر پروگرام کہتے ہیں۔ یہ سافٹ ویئر پروگرام کمپیوٹر کی رہنمائی کرتے ہیں انسانوں کی دی گئی ایک خاص ترتیب شدہ ہدایات کے ذریعے جنہیں کمپیوٹر پروگرامرز کہا جاتا ہے"۔

"جس طرح ہم دوسرے انسانوں کے ساتھ بات چیت کے لیے قدرتی زبان کا استعمال کرتے ہیں، اسی طرح ہم کمپیوٹر کے ساتھ بات چیت کے لیے ایک پروگرامنگ لینگوئج کا استعمال کرتے ہیں"۔ (باقی: صفحہ نمبر ۵۲)

اُردو املا اور ہم

ابو عالیہ ناز قاسمی

محترم قارئین: آپ عنوان دیکھ کر سوچ رہے ہوں گے کہ بھلا یہ بھی کوئی کہنے سننے اور لکھنے پڑھنے کی بات ہے؟ یہ محترمہ اردو؛ تو ہماری مادری زبان ہے، پدری نہیں، جس کے لیے ہمیں کسی قسم کا پاپڑ بیلنے کی ضرورت پڑے۔ اِس دنیا میں آنے کے بعد اِسی کی مقدس گود میں تو ہم اپنی آنکھیں کھولتے، سانسیں لیتے اور پرورش پاتے؛ اِس دنیا سے گذر جاتے ہیں۔

لطیفہ: ایک اسکول کے استاذ نے بچوں سے پوچھا کہ بتاؤ اردو زبان کو ''مادری زبان'' کیوں کہتے ہیں؟ ایک بچہ کھڑا ہو کر بڑی معصومیت کے ساتھ کہنے لگا۔ جناب! اردو زبان کو مادری زبان اِس لیے کہتے ہیں کہ صبح سے لے کر شام تک وہی اِس کو زیادہ استعمال کرتی اور بلا تھکان بولتی رہتی ہیں اور اِس کے علاوہ ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جب امی جان فراٹے بھر کر بولنے لگتی ہیں، تو پھر ابو کے بولنے کا نمبر ہی نہیں آتا۔

ہماری خطرناک غلطی: تو اِس سلسلے میں یہ بات یاد رکھیں کہ ہماری اِس قسم کی منفی سوچ ہی تمام غلطیوں کے لیے بنیاد کا پتھر ہے، جس کا ہٹانا ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ بہت ساری باتیں ہماری زندگی میں ایسی ہوتی ہیں، جن کا تعلق سیکھنے سکھانے سے ہوتا ہے۔ اُس کے حصول کے لیے کوشش اور محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہم یہ بات اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں کہ جب سامنے میں رکھی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی بغیر محنت کے ہمارے منہ میں نہیں پہنچ سکتا تو پھر سوچنے کی بات ہے کہ یہ املا یا اردو بغیر محنت کے کیسے درست ہو جائے گی؟ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ تحریر بھی انسان کی ایک اہم اور بنیادی ضرورت ہے، مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ انحطاطِ علمی کے اِس دور میں تعلیمی اداروں میں بھی املا و تحریر میں دن بہ دن کمزوری آتی جا رہی ہے۔ اِس کی اہم وجہ کچھ تو اپنوں کی مہربانی اور کچھ غیروں کی نادانی ہے۔ یہی ہماری پریشانی کی کہانی ہے۔ اس لیے طلبہ کو تو چھوڑ ہی دیجیے؛ اور عوام الناس کا رونا کیا؟ میں اپنے مشاہدہ کی بنا پر یہ بات افسوس کے ساتھ سپردِ قلم کر رہا ہوں کہ ہم رات دن پڑھنے پڑھانے والے اساتذۂ کرام کا بھی بہت سا املا درست نہیں ہوتا۔ یہ بات ہمیں کیوں یاد نہیں رہتی کہ صرف ماحول میں پیدا ہو جانے اور پروان چڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہاں صرف بولنا آجاتا ہے، لکھنا نہیں۔

ہماری حالت: ہم دعویٰ تو یہی کر رہے ہیں کہ {إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔} کہ ہم ہی مصلحِ اعظم ہیں؛ اصلاح کا نعرہ

خوب زور وشور سے بلند کرتے ہیں۔ہم یہ کہتے نہیں تھکتے ہیں کہ اردو ہماری مادری زبان ہے، اس لیے ہمیں سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔لیکن ہمیں اِس بات سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔کیوں کہ جب ہم عملی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو پھر پتا چلتا ہے کہ ہماری زبان دانی یا اردو دانی کی کہانی کا کیا حال ہے اور ہم نے اس کا کیا حشر کر رکھا ہے؟ اردو کو ہم نے تو کسی یتیم اولاد کی طرح ایک کونے میں ڈال رکھا ہے۔

یہ بھی نہیں معلوم: بڑے ہی افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ آج کل ہمارے اردو داں طبقہ کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ ہم جو کچھ لکھتے پڑھتے ہیں یا جس رسم الخط میں ہماری یہ کتابیں؛ اخبارات اور دیگر قیمتی رسائل وجرائد ہمارے سامنے شائع ہو کر آ رہے ہیں، وہ کون سے خط میں ہے؟ ہمیں شاید یہ بھی نہیں معلوم کہ اِس کی ابتدا کہاں سے اور کیسے ہوئی؟ خیر کوئی بات نہیں ہے۔

''اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلیں چراغ'' کی روشنی میں؛ قارئین کے لیے مفید سمجھ کر ہم تھوڑی سی روشنی اِس پر ڈال دیتے ہیں۔سب سے پہلے اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ عربی رسم الخط ''مادر خطوط'' ہے، لیکن ہمارا یہ مروجہ خط ''خط نستعلیق'' کہلاتا ہے۔نستعلیق دراصل ''نسخ اور تعلیق'' سے مرکب ہے۔ابتدائے اسلام میں عراق، حجاز اور عرب میں کوفی وعبرانی زبان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ابن مُقلَہ نے ۳۱۰ھ میں خط کوفی سے ''خط نسخ'' ایجاد کیا۔چوں کہ اس خط کی ایجاد کے بعد پہلے کے رائج تمام خطوط منسوخ ہو گئے، اس معنی میں اس کو ''خط نسخ'' کہا گیا۔

آمدم برسر مطلب: یہ چند باتیں اور معلومات؛ درمیان میں ضمنی طور پر آ گئیں۔اب آگے ہم اصل موضوع کی طرف رخ کرتے ہیں اور املا کے تعلق سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چند مثالیں:

(۱) ہمیں تو ''گُنا'' بمعنی ضرب یا دو چند کرنا اور ''گناہ'' میں فرق نہیں معلوم ہے۔بہت سے لوگوں کو احقر نے دیکھا ہے کہ ''گنا'' کی جگہ گناہ اور ''گناہ'' کی جگہ گنا لکھ دیتے ہیں۔اور بعض لوگ تو ''گناہ'' کو ''واؤ'' کے ساتھ یعنی ''گوناہ'' بھی لکھتے نظر آتے ہیں۔

(۲) اسی طرح بعض حضرات ایسے بھی مشاہدے میں آئے، جن کی تعلیمی لیاقت مسلّم اور تدریسی صلاحیت درس نظامی کے متوسطات تک پہنچی ہوئی ہے۔لیکن تحریر میں اُن سے بھی ایسی فروگذاشت دیکھی، جو کسی حد تک نا قابل معافی کی حدود تک پہنچتی ہے۔ایسے حضرات کے قلم سے ایسا جملہ سپرد قرطاس ہونا کہ فلاں کی طرف سے ''پورہ'' کیا جاتا ہے۔اور پورا کو ''پورہ'' لکھنا املا کی دنیا میں کتنی سنگین غلطی مانی جاتی ہے؟ ایسے حضرات اگر کہیں ممتحن بن جائیں اور کسی طالب علم کو جوابات صحیح نہ دینے کی صورت میں ناکام کر دیں اور اسے فیل بتانے کے لیے ایسا لکھ

دیں کہ ''یہ طالب علم فعل ہے'' تو طالب علم فیل ہو یا پاس، خود ممتحن صاحب کی علمی لیاقت پر سوالیہ نشان ضرور لگ جائے گا۔ یہ باتیں دُکھے دل کی آواز ہیں۔

تو لیجیے! ہم املا سے متعلق کچھ ایسے ضروری امور کی نشان دِہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جن کا جاننا ہمارے لیے بہت ہی ضروری ہے۔ تو سب سے پہلے ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ املا کے معنی کیا ہیں؟:

املا کا معنی: پُر کرنا، یاد رکھنا، بول کر لکھنا یا لکھوانا۔ (ادبی بھول بھلیّاں)

املا کی تعریف: پروفیسر رشید حسن خان (و: ۱۰/جنوری ۱۹۳۰ء بروز: جمعہ/ م: ۲۵/فروری ۲۰۰۶ء بروز: سنیچر) نے املا کی یہ تعریف لکھی ہے کہ ''املا لفظوں کی صحیح تصویر کھینچنا ہے۔'' (عبارت کیسے لکھیں؟ ص/ ۱۲)

جب ہمیں املا کی تعریف معلوم ہوگئی، تو اب چند باتوں پر دھیان دینا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ عمومی غلطیاں کہاں کہاں واقع ہوتی ہیں؟ اور اُس پر اچھی خاصی توجہ دینی اور محنت کرنی پڑے گی۔ تبھی ہمارا املا کنٹرول میں آئے گا، ورنہ تو اصلاح خواب وخیال ہی رہ جائے گا۔

(۱) حرف کی تبدیلی: کسی بھی لفظ میں جن حرفوں کو آنا چاہیے، وہی حرف لکھے گئے ہوں۔ جیسے: ''تلاطم'' ایک لفظ ہے، جس میں پہلا لفظ ''ت'' ہے، لیکن بعض لوگ اس کو ''طلاطم'' لکھ دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہی کہا جائے گا کہ یہ املا غلط ہے۔ اسی طرح ایک لفظ ''کارروائی'' ہے، جس کو بعض اہلِ قلم حضرات بھی ''کاروائی'' لکھتے یعنی ایک ''ر'' کو ہضم کر جاتے ہیں، جب کہ اردو میں کاروائی کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔

ایک پہیلی: ہمارے املا میں گزرنا (بالزا) اور گذرنا (بالذال) بھی کسی پہیلی سے کم نہیں ہے۔ جہاں ہما شما تو کیا؛ اچھے اچھے لوگ بھی اِس کی گلیوں میں راستہ بھٹک جاتے ہیں، تو اس سلسلے میں ایک اصول یاد رکھیں کہ:

فارسی کے پانچ مصادر ہیں: گذشتن، گذاشتن، گذاردن، پذیرفتن اور گزاردن۔ شروع کے چاروں مصادر میں ''ذ'' ہے اور آخری مصدر میں ''ز'' ہے۔ اول الذکر چاروں سے جو الفاظ بنیں گے، اُن میں ''ذ'' ہی ہوگا۔ اسی طرح چلنے، چھوڑنے اور پار کر دینے کے معنی میں تمام الفاظ گذشتن، گذاشتن، گذاردن ہی سے بنیں گے اور ''ذ'' سے لکھے جائیں گے۔ مثلاً: گذشتہ، زمانۂ گذشتہ، سرگذشت، درگذر، گذرگاہ، عمر گذراں وغیرہ۔

گزاردن ''ز'' والے کلمے سے جو الفاظ مشتق ہوں گے وہ ''ز'' سے ہی لکھے جائیں گے۔ اِس کے معنی پیش کرنا، ادا کرنا اور شرح کرنا کے ہیں۔ جیسے: گزارش، عبادت گزار، نماز گزار، مال گزاری، شکر گزار، تہجد گزار اور خدمت گزار وغیرہ۔ (حرف شیریں: ص ۳۸، ۳۹)

''پذیرفتن'' سے جو الفاظ آئیں گے ''ذ'' سے لکھے جائیں گے۔ جیسے: پذیرائی، دل پذیر، خلل پذیر اور پذیرفتہ

وغیرہ۔(حرف شیریں:ص۳۹)

(۲)شوشے کی غلطی: ہماری تحریروں میں سب سے پہلی اور بنیادی غلطی یہیں پر واقع ہوتی ہے: جیسے کہ ہم ''گلستاں'' لکھتے ہیں،تو اِس میں ''الف'' اور ''لام'' کے درمیان میں چار شوشے لازمی ہیں۔تین ''س'' کے اور ایک ''ت'' کے لیے۔لیکن املا کرتے وقت ہم اتنے بےخبر ہوتے ہیں کہ ہمیں الفاظ کے جوڑ پیوند کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا، اس لیے کبھی تو ایک شوشے کی برکت ہوجاتی ہے یا پھر ایک کم ہی ہوجاتا ہے۔یعنی کبھی تین یا کبھی پانچ شوشے ڈال دیتے ہیں۔اب ظاہر بات ہے کہ گلستاں کا یہ املا دونوں ہی صورتوں میں شوشے کی کمی زیادتی کی بنیاد پر غلط ہے۔اِسی ترازو اور کسوٹی پر بہت سارے الفاظ کو تولا اور اس کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔تفصیل کی اس مختصر صفحات میں گنجائش نہیں ہے،لہٰذا ''**العاقل تکفیه الإشارة**''یعنی عقل مندوں کے لیے بس اشارہ ہی کافی ہے۔اور بے وقوفوں کے لیے میکسیکو کی ''لینن گریڈ اور پٹنہ کی خدا بخش لائبریری'' بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی،اب آگے دوسری خرابی دیکھتے ہیں۔

(۳) نقطے: ہمارے املا میں ایک لاپرواہی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ کسی لفظ کا نقطہ کسی لفظ پر ڈال دیتے ہیں۔جس لفظ کا نقطہ ہو،اُسی لفظ پر ڈالنا چاہیے۔ورنہ تو آپ ''نبی''لکھیں گے،جس میں پہلے ن ،ب اور پھر آخر میں ی ہے۔اب تحریر کرتے وقت ہم نے ''ن'' کا نقطہ ''ب'' کی جگہ اور ''ب'' کا نقطہ ''ن'' کے مقام پر رکھ دیا،تو معلوم ہوا کہ پڑھنے والے ''بنی'' پڑھ رہے ہیں، جب کہ لکھنے والے کا مقصود ہرگز یہ نہیں ہے۔یہ خرابی صرف اِس وجہ سے پیدا ہوئی کہ املا میں ''نبی'' کا نقطہ تقدیم وتاخیر کا شکار ہے۔

لکھیں موسیٰ پڑھیں خدا: ہم اپنی کوتاہی وکاہلی اور غفلت کی بنا پر املا کی اہمیت کو سمجھیں یا نہ سمجھیں،لیکن حقیقت یہی ہے کہ املا کی بڑی اہمیت ہے۔اگر اِس کا مکمل خیال نہ رکھا جائے تو لفظ کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔بعض دفعہ یہ سمجھنا بھی دشوار ہوتا ہے کہ یہ لفظ کیا ہے اور کس معنی میں مستعمل ہے؟ پڑھنے والے سوچ کے دریا میں غرق ہوجاتے ہیں کہ کیا پڑھیں اور کیا نہ پڑھیں؟ اور اِس کا مطلب کیا ہوسکتا ہے؟ یعنی نویسندہ ایک لفظ کو اس کے املا کے برخلاف لکھ کر قاری کو ایک طرح کی الجھن اور ذہنی پریشانی میں ڈال دیتا ہے،بل کہ اِس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اُسے اس لفظ کے علاوہ اٹکل سے کوئی دوسرا لفظ پڑھ لے، جو کہ خود نویسندہ کے نزدیک مقصود نہیں ہوتا۔جیسا کہ قارئین کرام نے ''نبی'' کے املا میں محسوس کیا ہوگا۔اس لیے بہ طورِ خلاصہ اوپر کی تحریر سے معلوم ہوا کہ یہ بہت ہی ضروری ہے کہ لکھنے والے کی تحریر کا خط کم از کم ایسا صاف ستھرا اور واضح ہو کہ خود پڑھ سکے۔ورنہ نقطے کی تقدیم وتاخیر بھی پڑھنے والے کو کچھ اور پڑھنے پر مجبور کرے گی،جس کا نقصان یہ ہوگا کہ مضمون تحریف معنوی کا شکار ہوگا۔